لاہور نامہ

سرورق	صادقین
سالِ اشاعت	۱۹۸۳ء
تعدادِ اشاعت	ایک ہزار
قیمت	۳۰ روپے

پرنٹر : اے جے پرنٹرز پرتاپ بھون نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ناشر:-

وبھا پبلی کیشنز بی ۲۲ بی کے دت کالونی جورباغ روڈ نئی دلی ۱۱۰۰۰۳



کرشن کمار گورٹو

۱۹۲۱ء - ۱۹۴۷ء

تصویر ۲۶ ویں سالگرہ کی

انتساب

کتاب کسی سے منسوب کرنے کا رواج پرانا ہے قرونِ وسطیٰ سے ہی نہیں عہدِ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ یہ دستور محض ادائیگی رسم نہیں، کچھ اور بھی ہے۔

میں یہ کتاب اپنے منجھلے بھائی شری کرشن کمار گورٹو سمیت ان لاکھوں بے گناہوں کی یاد سے منسوب کرتا ہوں جو تقسیمِ ہند کے وقت بے موت مارے گئے۔

سنتوش کمار

دیباچہ

یہ لاہورنامہ وہی ہے جو قارئین پرتاپ نے جنوری ۱۹۸۱ء سے لے کر مارچ ۱۹۸۱ء تک روزنامہ پرتاپ کے سنڈے ایڈیشنوں میں قسط وار پڑھا تھا۔ ہر قسط بیسیوں مراسلے لانے لگی۔ بہت سے واہ وا والے اور بعض نہایت لطیف لغزشوں کی طرف معنی خیز توجہ دلانے والے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ میں شاید کچھ بھی نہ لکھتا اگر میرے ساتھی شری پروانہ رودلوی مجھے کچھ نہ کچھ ضرور لکھنے کی ترغیب نہ دیتے اور اس سے بھی بڑھ کر اگر میرے پاکستان سے لوٹنے کے فوراً بعد وگیان بھون میں منعقدہ میڈیا کنونشن میں پاکستانی سفارت خانہ کے قونصلر پریس شری منیر شیخ مجھے یہ کہہ کر بے بس نہ کر دیتے کہ ہم آپ کے تاثرات پڑھنا چاہتے ہیں۔

جب سب قسطیں چھپ چکیں تو کرم فرماؤں نے انہیں کتابی صورت دینے کا سجھاؤ دیا۔ سجھاؤ بہت خوب لیکن اس کام کا بیڑا اٹھائے تو کون۔ مہینوں گذر گئے۔ مجھے بھی کئی بار اس وسیع و عریض ملک میں ادھر ادھر جانا پڑا۔ آخری ساتھی محمد اکرام آڑے آئے۔ کتابت کی محنت، محبت کا بار سنبھالا۔ دوسری مصروفیات کی وجہ سے وقت تو لگ گیا۔ اسی ادھیڑبن میں ایک برس گذر گیا۔

چند ماہ پہلے کتابت مکمل اور تصویروں کا انتخاب ہو چکا بلکہ کاپیاں تک جڑ چکیں تو خیال آیا کہ سفرنامہ کے بارے میں اگرچہ قارئین بہت کچھ لکھتے رہے تھے تاہم کسی ایسے شخص سے لکھنے کو کہا جائے جو تاریخ، سیاست اور اردو ادب تینوں پر ایک سی نظر رکھتا ہو۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ تو قرعہ انتخاب شری اندر کمار گوجرال سابق سفیر ہند متعینہ ماسکو پر پڑا۔ ان کی یہ کرم فرمائی

کہ بعنوان " میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند " وہ کچھ لکھ دیا جس نے تحریر کو سند عطا کر دی۔ جب اتنا کچھ ہو چکا تو سوچا کہ لگے ہاتھوں ٹائٹل بھی کسی نامور آرٹسٹ سے بنوایا جائے۔ ایک بار پھر نظر دوڑائی تو کتاب کی زبان اور اس کے مروجہ رسم الخط کے پیش نظر صادقین سے بہتر کوئی صورت سامنے نہ آئی۔ اُس فقیر نے اس حقیر کی لاج رکھ لی۔

رہا طباعت کا سوال تو یہ بھی کوئی ایسی ٹیڑھی کھیر نہیں۔ پرتاپ بھون کا چھاپہ خانہ میری خالہ جی کا گھر نہیں۔ پر ایسی کوئی بے اعتباری بھی نہیں کہ نیوز ایڈیٹر کا لاہور نامہ نہ چھپ سکے۔ شری انل نریندر نے طباعت کی ذمہ داری قبول کر لی لیکن اس اشارے کے ساتھ کہ سیلز آرگنائزیشن کی عدم موجودگی میں بڑی مشکل ہوتی ہے۔ گھاٹا نہیں پڑ جانا چاہئے۔

لاھور نامہ کی اشاعت کوئی تجارتی معاملہ نہیں ہے۔ ایک روحانی تقاضہ ہے جو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ تقسیم وطن کے وقت لاہور سے متاعِ عزیز لٹا کر نکلنے والے کے تاثرات اور آج کے حالات سے اس زمانہ کا موازنہ محفوظ رہے۔

لاہور نامہ میں جو تصویریں دی جا رہی ہیں ان میں سے بیشتر 'ڈان انٹرنیشنل' اور 'مشرق' لاہور کے پرچوں سے لی گئی ہیں۔ کچھ ایک مثلاً قائداعظم کا مزار پاکستانی سفارت خانہ نے راقم کی درخواست پر مہیا کیں۔ 'استاد دامن' کی تصویر فرمائش پر مشرق سے ایک ساتھی نے بھیجنے کی زحمت فرمائی۔ تصویر 'علامہ اقبال کا مزار' نقوش کے لاہور نمبر سے لی گئی ہے۔ جلتے لاہور کی جو تصویریں وہ سب اصلی ہیں۔ ہوا یوں کہ پرتاپ میں قسطیں ختم ہونے کے بعد جلد ہی مجھے ایک کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے لاطینی امریکہ جانا پڑا۔ واپسی پر ڈاک سے ایک لفافہ در لفافہ نکلا اور اس میں سے جلتے لاہور کی تصویریں نکلیں۔ ہر تصویر کے پیچھے فوٹوگرافر کا نام اور جلتے بازار کا نام اور کچھ اور تفصیل ٹائپ شدہ لگی تھی۔ ترکتازیوں کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ سند سمجھ کر دی جا رہی ہیں۔

میں ایک بار پھر شری پروانہ ردولوی، شری منیر شیخ، شری اکرام، شری اندر کمار گوجرال، اور شری صادقین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان سب کی دین کے بغیر یہ کتاب اس شکل میں آپ کی خدمت میں پیش نہ ہو سکتی تھی۔

میں زیبرِ ہالاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

سفرنامہ لکھنے کا آرٹ قدرے مشکل ہے اگر لکھنے والے کی نظر میں خوردبینی کی قوت نہ ہو تو اس کے مشاہدات سطحی ہو جاتے ہیں اور اگر وہ محض تفصیلات میں کھو کر رہ جائے تو مکمل تصویر کا خاکہ دھندلا جاتا ہے۔

سنتوش کمار ایک کہنہ مشق فنکار ہیں۔ اور اپنے لاہور اور کراچی کے سفرنامہ میں انہوں نے اپنی کہنہ مشقی کا خوبصورت ثبوت دیا ہے۔ لاہور اور کراچی کی یاد ہماری پیڑھی کے لئے ایک خاص کشش رکھتی ہے اس کشش کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے مگر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جنم پیدائش سے رشتہ بھی ایک عجیب جذبہ سے بھرا ہوتا ہے لیکن جب تواتر یہ دھاگہ توڑ دے اور پھر لگ بھگ چار دہائیاں بن دیکھے سنے گذر جائیں تو زندگی ایک خلا بن کر رہ جاتی ہے۔ سنتوش جی کو یہی خلا اور یہی کشش "لاہور دیکھ آ، دیکھ آ" کی طرف لے گئی۔ جو انہوں نے وہاں دیکھا وہ بھی عجیب ویرانی تھی۔ سڑکیں اور محلے وہی، ان کے نام وہی، مکان وہی، لیکن مانوس مکیں نہیں۔ کبھی کبھی تو دیواروں سے لپٹ جانے کو جی چاہتا ہوگا۔ اور پھر ایک عجیب سا احساس! کبھی بے وقوفی کا، کبھی خلا کا اور کبھی زندگی کے فانی ہونے کا۔

سنتوش کے سفرنامے میں ہر نئے پن کا ذکر جذبات سے بھرپور ہے۔ ہماری عمر کے لوگ اور ہمارے وہ بزرگ جن کا ہندوستان کی جنگ آزادی سے رشتہ تھا۔ ان سب کے لئے یہ جگہ، سیاست انقلاب، ملک کی تواریخ کے کئی موڑوں کی یاد سے بھری پڑی ہے۔ مدتوں پہلے پچھلی صدی

میں چارلس بریڈلا (۱۸۳۳ - ۱۸۹۱) برطانوی پارلیمنٹ کے ایک سنجیدہ ممبر تھے۔ ۱۸۸۹ء میں انہوں نے پارلیمنٹ میں ایک بل بدیں مطلب پیش کیا کہ ہندوستان میں جمہوری آئین کا نفاذ عمل میں لایا جائے اور ہندوستان کے جمہوری ادارے کا انتخاب اہلِ ہند کریں۔ ہندوستان کی سیاست میں یہ بہت بڑا موثر تھا۔ اسی سال یعنی ۱۸۸۹ء میں بریڈلا بمبئی میں کانگرس کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرنے تشریف لائے تھے۔ اس زمانے کے کانگرس صدر صاف دل اور روشن دماغ انگریز ہی ہوا کرتے تھے۔ اس اجلاس کے صدر تھے۔ ولیم ویڈر برن۔ بمبئی والوں نے ان دونوں کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ اس کے چند برس بعد لاہور کا یہ تاریخی ہال شری بریڈلا کے نام نامی سے منسوب کردیا گیا۔ جہاں ہم نے جواہرلال کی روشن دماغ تقریریں سنی تھیں۔ یہیں ہم نے لاہور سٹوڈنٹس یونین کے سالانہ اجلاس میں پہلی مرتبہ جوش ملیح آبادی کی دل ہلا دینے والی بلند آواز میں انقلابی کلام سنا تھا۔

سنو اے بستگان زلف گیتی ؎
ندا یہ آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

میں اس زمانے میں لاہور اسٹوڈنٹس یونین کا صدر تھا جب ہم لوگوں نے جوش کو دوبارہ مدعو کیا تو دوسری جنگ عظیم شروع ہوچکی تھی۔ اس وقت کا اُن کا ایک مصرعہ بار بار یاد آتا ہے۔

؎ جتنے حرام خور تھے کپتان ہوگئے۔

یادوں کی بارات جب چلنے لگتی ہے تو کئی اور واقعات ذہن میں جھلکنے لگتے ہیں۔ ہرن مکرجی، ڈاکٹر محمد اشرف، میاں افتخار الدین اور بزرگ سیاستدان ڈاکٹر سیف الدین کچلو سب کے نام ابھر آئے ہیں۔

گول باغ، وولنر ہال کے قریب سے گذرتے ہوئے سنتوش جی کے ذہن کے پردے پر جن جلسوں، اور جلوسوں کا نقشہ ابھر آیا ہے میں بھی خود کو اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ وہیں کھڑا دیکھتا ہوں۔

ہم سب کی عمر کم تھی مگر عزم پہاڑ سے ٹکرانے کا تھا۔ سامراج شاہی کو ختم کرنے کی سوچ میں اٹوٹ وشواس۔ ہر جلسہ بنے بھائی کے اس گانے سے شروع ہوتا تھا۔

ہم حملہ کریں گے لشکر پر۔ ہم قبضہ کریں گے دفتر پر
ہم ٹوٹ پڑیں گے قیصر پر
روکے تو کوئی ہم کو ذرا
سارا سنسار ہمارا ہے۔

اور پھر تواریخ کے ایک ہی ہلّے نے ہندوستان کے اتہاس کے دھارے کو بدل ڈالا یوں خواب کی تکمیل ہوگئی۔ لیکن اس کے ساتھ ملک، دل، رشتے، ذہن بٹ گئے۔ قافلہ در قافلہ، جوق در جوق کئی سنتوش بریڈلا ہال، وولنر ہال، گول باغ اور لاجپت رائے ہال، پیچھے چھوڑ کر اِدھر آگئے۔ سنتوش تو پھر بھی واہگہ پار کی نئی دنیا اور یادوں کے کھنڈر دیکھ آئے ہیں۔ میں آج تک نہیں جا سکا کئی بار سوچا ہے کہ اپنے بچوں کو پرچھائیوں کی دنیا دکھا دوں۔ سنتوش کے سفرنامے کی خوبصورتی صرف جذباتی نہیں۔ انہوں نے آج کی سیاست اور سماجی الجھنوں اور کشمکش کو نازک حس کے ساتھ سمو دیا ہے اُن کے کردار زندہ، بولتے، سوچتے لوگ ہیں جو فوجی بوٹوں کی چمک اور کھڑکھڑاہٹ میں عظمت نہیں مجبوری محسوس کرتے ہیں اور دلوں میں ارادے باندھتے ہیں کہ کس طرح تواریخ کے دھارے کو موڑ دیں۔

سفرنامے کی خوبصورتی یہ ہے کہ زبان شستہ، اور ادبی ہو اور اس میں عصری تاریخ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہو۔ اگر ہیون سانگ اور مارکو پولو نے اپنے سفرنامے نہ لکھے ہوتے تو تواریخ کا ایک پورا دور کورے کاغذ کی طرح رہ جاتا۔ یوروپ کو ایشیا کی عظمت کا احساس ہی نہ ہوتا۔ اور نہ ہی چینی یاتری، بودھ مت کی گہرائیوں میں اُتر پاتا۔

میں ایک پڑھنے والے کے ناطے خاص طور پر سنتوش جی کے سفرنامے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

اِندر کمار گجرال

تعارف

" لاهورنامه" اخبارِ عام کے پنڈت بالکرشن گورٹو کے یادگار سپتر (شہزادے یا راجکمار) "سنتوش کمار" کے اندازِ نگارش کی شاہکار تالیف و تصنیف کا نام ہے جس میں ابنِ "شہر مادھو لال حسین لاہور" کی رنگین داستانیں بھی ہیں اور اس "پاکستان" کے افکار و حوادث" کا بھی چرچا ہے جس میں "چناب" موجیں مار رہا ہے اور جہاں کبھی وارث شاہ کے "ہیر و رانجھا" اور "سوہنی مہیوال" کے عشق و محبت کے ترانے گائے جاتے تھے۔ جہاں کے "پریزادوں" کے بارے میں مولانا غنیمت کنجاہی نے کہا ہے ؎

بمکتب می رود طفلِ پریزاد
مبارکباد مرگِ نو بہ استاد

سنتوش کمار جی نے اس سفرنامہ یعنی "لاہورنامہ" میں جہاں بہت سی رومانی اور ادبی ثقافتی داستانوں کو نہایت دلکش اور محتاط انداز میں پیش کیا وہاں" استاد دامن" جیسی بعض یادگار اور پرانی شخصیتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے اور کہیں کہیں پاکستانی "پاک دامنوں" پر کفر کے چھینٹے بھی اڑائے ہیں مگر اس انداز کے ساتھ کہ پڑھنے والے کی زبان پر یہ دعا جاری ہو جائے ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ — اور غالب و یگانہ کے اشعار گنگنانے لگیں ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا ؛
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
——— (غالب)

بدگمانوں کی بدگمانی سے
پاک دامن بچے نہ دامن چاک
——— (یگانہ چنگیزی)

مختصر یہ کہ "سنتوش کمار کا اندازِ نگارش اس قدر پیارا سلجھا ہوا ہے کہ پاکستانیوں کے "طبع نازک" پر بھی گراں نہ گذرے گا اور پڑھ کر یہ محسوس کریں گے کہ "لاہورنامہ" میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ پاکستان اور پاکستانیوں کی صحیح عکاسی ہے۔ یاد رہے کہ لاہور میں سنتوش کے ایک

لاھــورنامـــہ

پیارے بھائی کرشن کمار پاکستانی چھروں کا شکار ہوکر موت "کا تلخ جام" بھی نوش کر چکے ہیں لیکن اس بات کے باوجود ان کے اندازِ نگارش میں تلخی کا نشان تک نہیں ہے یہ ان کی شرافت اور اخلاق کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

غازی کے دل و دماغ کے جھروکوں میں لاہور سے متعلق بہت سی نہیں بلکہ بے شمار یادیں پھڑپھڑا رہی ہیں اور مطالبہ کر رہی ہیں کہ غازی انہیں بھی اس "تقریظ" میں "رسوائی" کا اعزاز اور شرف بخشے لیکن غازی کیا کرے کہ یہ سب یادیں "بحرِ بیکراں" ہیں اور یہ "تقریظ" ان کی متحمل نہیں ہے ان کے لئے تو "سفینہ" چاہیئے غالبؔ نے کیا ہی خوب کہا ہے کہ ع

" سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے "

مرزا غالب اجڑی ہوئی دہلی کے اپنے بعض احباب اور رنگا رنگ محفلوں کی یاد میں جس طرح اشکبار ہوئے تھے " غازی بھی اپنے خزاں رسیدہ اور "شہر خموشاں" میں بسنے والے دوستوں اور لاہور کی رنگا رنگ محفلوں کی یاد میں اسی انداز میں " اشکبار" ہوکر رخصت ہوئے ہیں ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

مرزا بشیر الدین محمود احمد ربوہ چنیوٹ میں، سید عطاء اللہ شاہ بخاری ملتان میں، اور چودھری افضل حق مولانا مظہر علی اظہر لاہور میں ابدی نیند کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ مہاشہ کرشن کی راکھ جمنا و گنگا کی موجوں میں بہہ گئی ہے۔ لاہور کی رنگا رنگ محفلوں کی یادیں " طاقِ نسیاں" ہوگئی ہیں اور جو صورتیں خاک میں پنہاں ہوگئی ہیں اُن کی یاد میں غازی شاعر کا یہ شعر گنگنا رہے ہیں ؎

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

خانِ غازی کابلی

کوچہ رحمان دہلی - ۶

اپنے ہی شہر میں اجنبی

میری زندگی کی بیسویں بہار تقسیم ہندوستان سے خزاں بن گئی تھی۔ قسامِ ازل نے شاید لاکھوں انسانوں کی لوح تقدیر پر یہی لکھ رکھا تھا کہ "۱۹۴۷ء آئے گا تو تڑپنے کی اجازت ہو گی نہ فریاد کی، گھٹ گھٹ کے مرجاؤ یہی مرضی صیاد کی ہوگی"۔

یہ وہ دور تھا جب قوم پرست علماء کا یہ نظریہ شکست کھا چکا تھا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں۔ جب ایک زمانے کا فاتح عالم دین حجازی سیاست اسلامیہ ہند کی باندی بن چکا تھا جب مذہب کے نام پر "برزن" کی اذنِ عام ہو چکی تھی جب کلام پاک کے نام پر صدیوں کے انسانی اور وطنی رشتے ناپاک سمجھ کر کاٹے جا رہے تھے۔ اسی عالم بے بسی اور حالتِ غین میں سترہ ستمبر سن سینتالیس کو گھر بار چھوڑ، متاعِ عزیز لٹا، بہت بے آبرو ہو کر لاہور سے نکلا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ اس شہر میں پھر کبھی قدم رکھ سکوں گا جہاں جنما اور پلا تھا۔ جہاں جوان ہوا تھا۔ جہاں پندرہ سے بیس برس تک کی عمر میں وہ بہت کچھ کر چکا تھا جو میرے ہم عمر چمن، گوپی، منا اور نواز وغیرہ کرتے تھے۔ نہیں جانتا تھا کہ اس شہر کے صحافیوں سے کھل کر تبادلہ خیال کر سکوں گا۔ جہاں خود اس عمر میں میدان صحافت میں قدم رکھ چکا تھا۔ اور جس شہر میں ۱۲۰ برس پہلے صحافت کی بنیاد رکھنے والے خود میرے دادا پنڈت مکند رام بانی اخبار عام (اردو) و مترولاس (ہندی) تھے۔

لاھــــورنامـــہ

سینتالیس سے ستتر تک کے تیس سال بس یونہی گذر گئے، کچھ صحافت اور کچھ ٹریڈ یونین میں بال سفید ہو گئے۔ پھر پچھلے برس خیال آیا کہ منا زندگی کا کیا بھروسہ ہے ایک بار لاہور دیکھ آ۔ پُرانا مقولہ ہے۔

"جنے لہور نہیں ویکھیا او جمیا ای نہیں۔"

دیکھ آ، دیکھ آ، اپنا شہر لاہور، ایک بار پھر دیکھ آ، کوئی پُرانا یار نہ ملے تو نئے یار بنا آ— کوئی بننے کو تیار نہ ہو تو پُرانے گلی کوچوں سے ہمکلام ہو آ— وہ بھی نہ پہچانیں تو کسی مسجد میں شب بسری کے بعد نور کے تڑکے لوٹ آ، لیکن ہو آ، ہو آ، اپنا شہر لاہور دیکھ آ—

بس اسی عزم کے ساتھ پاکستانی سفارت خانہ کے کونسلر پریس شری مُنیر شیخ کو ٹیلیفون کیا کہ لاہور جانا چاہتا ہوں۔ بولے "جاؤ"— میں دُوسرے روز ویزا کا فارم بھرنے پہنچا۔ فارم بھرا تو لاہور لکھا اور کہہ دیا کہ بس میری دلچسپی صرف لاہور تک محدود ہے، بولے کراچی بھی ہو آؤ، میں نے کراچی بھی لکھ دیا، پھر بولے اسلام آباد بھی ہو آؤ، میں نے راولپنڈی بھی لکھ دیا اور کہہ دیا کہ وہاں جانے کا فائدہ تب ہے اگر صدر ضیاء سے انٹرویو کا انتظام ہو جائے۔ بولے اُس کا انتظام سر دست مشکل ہوگا بس نجی دورے پر ہو آؤ میں نے کہا کہ جرنلسٹوں اور اُن کی یونین کے لیڈروں سے ملاقات کی اجازت تو ہو گی؟"

بولے۔ ہاں اُنہیں ملو شوق سے ملو۔ بولے کتنے دِن کے لئے جانا چاہو گے میں نے مدت کے خانہ میں دس روز لکھدیا— بولے بس،

ہاں کافی ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ "فقیروں کے بھیس میں تماشائے اہل کرم دیکھنے کے لئے" بولے کوئی رشتہ دار، واقف کار، کسی کا نام لکھ دو— میں نے کہا۔ کسی سے ذاتی تعارف نہیں برسوں پہلے نقوش کا لاہور نمبر دیکھا تھا۔ اس کے باب صحافت میں اپنے بزرگوں کے بارے میں دو تین صفحے پڑھ کر اُس کے ایڈیٹر محمد طفیل صاحب کو چِٹھی لکھی تھی انہوں نے محبت سے جواب بھی دیا تھا بس وہی واقفیت سمجھئے— کہنے لگے وہی لکھ دو— دفتر 'پرتاپ' لوٹ کر 'مشرق' لاہور کے نیوز ایڈیٹر کو بنا اُن کا نام جانے — ایک خط لکھ دیا کہ ۱۵ دسمبر کو سرحد پار کروں گا۔ (پاکستان کے سفارت خانہ کی وساطت سے 'پرتاپ'

میں بھی ایک پاکستانی اُردو اخبار آتا ہے۔) مدرسہ اسلامیہ گلبرگ کے مہتمم مولانا ابومحمد القاسمی صاحب کو بھی ایک خط لکھ دیا کہ ۱۵ دسمبر کو لاہور پہنچوں گا۔ اور اگر کہیں بھی ٹھکانہ نہ بنا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں گا۔ یہ مولانا دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ تقریب میں شامل ہونے آئے تھے۔ اُن کے ایک ساتھی مولانا عبدالخالق گیلانی کی دستارِ فضیلت دلّی میں گم ہوگئی تھی، بہت پریشان تھے اور اس کی تلاش میں دفتر پرتاپ آئے تھے۔ میں نے دیوبند میں اپنے نامہ نگار حامد آفسر کو چٹھی لکھ دوسری دستار منگوالی تھی اور پاکستانی سفارت خانہ کی وساطت سے بھوریہ (ضلع گجرات) میں مولانا گیلانی کو بھجوادی تھی۔ بس اتنی شناسائی تھی۔ دو چٹھیاں کراچی میں اُن کو لکھیں جو کبھی دلّی آئے تھے اور جن کے ساتھ دو دو لمحے گذارے تھے۔ اُنہیں لکھ دیا تھا کہ لاہور سب سے پہلے دفترِ 'مشرق' میں قدم رکھوں گا کوئی پیغام ہو تو وہیں بھیج دینا۔ ایک تو پٹنہ کے قدیم شہری سّری بشیر الحسن تھے جو ۳۲ برس بعد پٹنہ جارہے تھے اور دلّی میں میر مشتاق احمد کی نشست گاہ میں ملے تھے۔ دُوسرے عبدالرشید رستم قلم تھے جو رشتہ داروں سے ملنے آئے تھے اور ہندوستان میں فنِ خطاطی کے نمونے دیکھنے دفتر پرتاپ میں بھی تشریف لائے تھے۔ عبدالمجید پروین رقم اور تاج زرّین رقم کے بعد پاکستان میں اب اُن کا طوطی بولتا ہے۔ اُن کا ہی سکّہ چلتا ہے خطِ نستعلیق، خطِ نسخ، اور خطِ طغرہ کے اُستاد ہیں۔ بہترین فنکار بھی ہیں اور بے حد شریف انسان بھی۔ ملنگ بھی ہیں، بے ڈھنگ بھی، دولت سے نہیں انسانوں سے محبّت کرتے ہیں

؎ خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

دلّی سے روانگی سے دو روز پہلے مولانا قاسمی صاحب کا جواب موصول ہوا۔ لکھا تھا جب تک چاہو شوق سے میرے پاس ٹھہر سکتے ہو، فارسی کی دو کتابیں لانے کی فرمایش بھی کی تھی جو پاکستان میں نایاب ہیں۔ ایک روز پہلے کراچی سے عبدالرشید صاحب کا تار بھی پہونچ گیا کہ آپ کی آمد کا انتظار رہے۔

"جویائے حق" اور "دیوانِ جامی" کی تلاش میں نکلا، کتب خانہ عزیزیہ، کتب خانہ رحیمیہ، کتب خانہ رشیدیہ وغیرہ سب چھان مارے، گوہرِ مقصود ہاتھ نہ لگا تو انہی دو کانوں سے لکھوالیا

کہ یہ کتابیں یہاں بھی نایاب ہیں۔کبھی ملیں گی تو بھیجنے کا انتظام کردیا جائے گا۔اس سلسلہ میں میسر صاحب کو بھی زحمت دی۔انہوں نے بھی ہزار کوشش کی کہ کہیں ہاتھ لگیں وہ نہ ملنی تھیں نہ ملیں۔ہم ہاتھ ملتے رہ گئے۔

۱۴ر دسمبر کی رات "فرنٹیر" سے امرتسر روانہ ہوا۔کچھ یار دوست سٹیشن پر پہنچے تھے۔ جب سب سے اجازت لے چکا اور گاڑی سرکنے لگی تو ایک اجنبی ہاتھ ملانے کے لئے آگے بڑھا۔ میں نے پوچھا آپ کون ہیں، بولے: "یہ گورنمنٹ بتائے گی" گاڑی رفتار پکڑ رہی تھی وہ کون تھا بھارت سرکار کا کوئی سراغ رساں یا پاکستانی سرکار کا کوئی جوابی سراغ رساں یہ وہ جانے یا دونوں حکومتیں۔مجھے اس سے کچھ سروکار نہ تھا میں ایک آزاد ملک کے آزاد شہری کی حیثیت سے جارہا تھا۔ہر صورتِ حال کے مقابلہ کے لئے تیار ہو کر جارہا تھا۔خالی ہاتھ جارہا تھا۔بے میل دل لے کر جارہا تھا۔نہ کچھ لے کر جارہا تھا نہ کچھ لانے کی توقع رکھ کر جارہا تھا جیب میں چند تعارفی چٹھیاں تھیں اور بغل میں ڈنڈا۔

امرتسر پہنچا تو دوست صحافیوں کی کمی نہ پائی، ۳۲ برس پہلے لاہور سے دلی آتے امرتسر رکا تھا۔اب دلی سے لاہور جانے کے لئے امرتسر میں پڑاؤ کیا تھا۔دوستوں سے پوچھا کہ لاہور ریل سے جانا بہتر رہے گا یا بس سے۔کہنے لگے ریل کا سفر زیادہ وقت لے گا۔ٹرین میں ایک بھی سمگلر پکڑا گیا تو سفر مزید دشوار ہو جائے گا۔جب تک اِدھر اُدھر کے کسٹم والے ریل کا کونہ کونہ نہ چھان ماریں گے، تم بھی پھنسے رہو گے۔آخر طے پایا کہ جرنیلی سڑک جسے اب دلی سے سرحد تک شیرشاہ سوری سے منسوب کردیا گیا ہے۔اُسے ہی پکڑا جائے۔ایک دوست نے موٹر کار کا انتظام کردیا وہ مجھے ۱۵ر کی صبح کو دس بجے سے پہلے ہی ہندوستانی کسٹم چوکی تک پہنچا آئی۔اِدھر سے جانے والوں کی بھیڑ پہلے سے موجود تھی۔میں اپنا پہیئے دار سوٹ کیس خود ہی گھسیٹتا کسٹم کاؤنٹر تک جا پہنچا اور وہاں کھڑے انسپکٹر صاحب کو اپنا وزیٹنگ کارڈ دے کر بولا کہ بھئی ذرا جلدی کردو۔پاسپورٹ دیکھ کر بولے اس پر امیگریشن کی اجازت تو ہے نہیں میں نے کہا کہ مجھے تو اس نئے قاعدے کا پتہ نہیں۔ یہاں بھی تو کوئی افسر ہوگا جو مہر لگا دے انہوں نے ایک چپراسی ساتھ کردیا اور چند منٹ میں وہ خانہ پُری بھی مکمل ہوگئی۔ابھی کاؤنٹر نہ کھلا تھا۔میں نے سوٹ کیس اُسی انسپکٹر صاحب کی نگرانی میں چھوڑ سامنے والی کرنسی تبادلہ کی دکان کا رخ کیا۔دوسو روپے دے کر ۲۴۰ پاکستانی حاصل کئے بس وہی

رقم تھی جو میرے پاس تھی، جوڑے کرجارہا تھا۔ بعدازاں لاہور پہونچ کر پتلون کی ایک جیب میں ہاتھ ڈالا تو دس دس کے چار پانچ بھارتی نوٹ بھی ہاتھ لگے۔

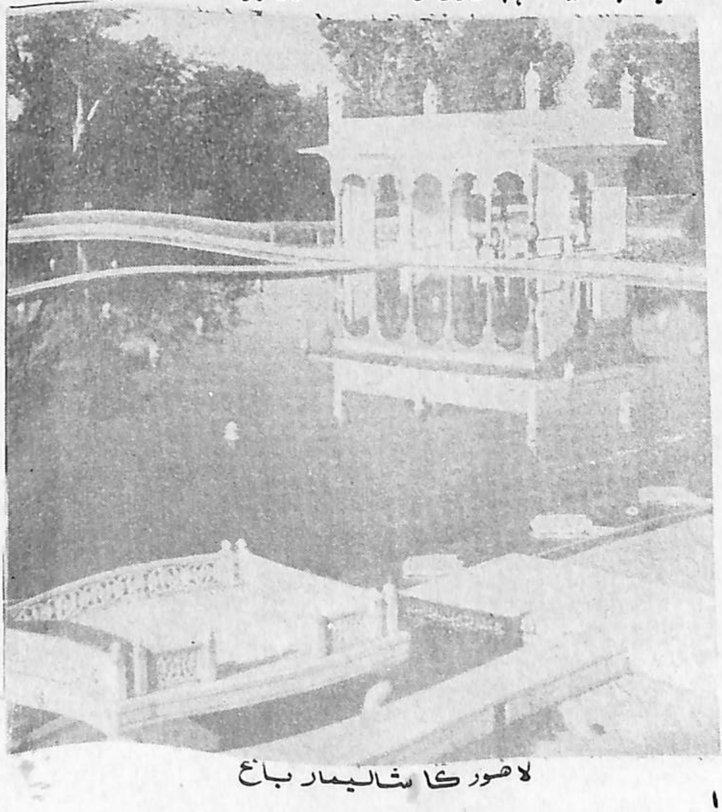
بھارتی کسٹمز انسپکٹر نے کام باقاعدہ شروع ہونے تک گرم چائے کی پیالی بھی پیش کردی۔ جب کام شروع ہوا تو بولے سوٹ کیس میں کیا ہے؟

"چند کپڑے چند چھوٹے موٹے تحفے" میں نے جواب دیا۔

" ذرا کھولنا؟" میرے کہنے پر کہ سوٹ کیس کھلا ہے مجھے تالا لگانے کی عادت نہیں۔ وہ خاموش ہوگئے۔ اور اُسے بنا کھولے چاک سے کچھ لکھ کر پاس کردیا۔ پھر میرے کندھے سے لٹکتے بیگ کی طرف دیکھ کر بولے اس میں کیا ہے؟ جواب پاکر کہ کچھ رسالے ہیں "سائنس کی دُنیا" اور کچھ رسالوں کے ساحر نمبر تو اُسے بھی بنا دیکھے پاس کردیا۔ پھر بولے بریف کیس میں کیا ہے بتانے پر کہ اس میں نظر و دھوپ کی عینکیں، اور چونا تمباکو کی ڈبیا ہے۔ لاہور میں مہنگے پان نہ چبا سکا تو انہیں ہی رگڑ کر کام چلالوں گا۔ اُسے بھی پاس کردیا۔ یہ سارا کام چند منٹ میں پورا ہوگیا۔ انسپکٹر صاحب بولے پورٹر بلوادوں، میں نے یہ کہتے ہوئے کہ وہ تو دس روپے لے لے گا۔ میرے پاس پیسے کہاں؟ خود ہی سوٹ کیس اُٹھانے لگا۔ تو انسپکٹر نے ایک چپڑاسی کو آواز لگائی اور اُسے میرا سوٹ کیس جہاں تک وہ جاسکتا تھا پہنچانے کی ہدایت کی۔ میں کچھ دُور تک سوٹ کیس خود گھسیٹتے ہوئے پاکستانی سرحد میں داخل ہوگیا۔ کسٹمز والوں کو پاسپورٹ اور ویزا دکھایا۔ ویزا پر چونکہ کچھ نہ لکھا تھا کہ پہلے کہاں جارہا ہوں اور کس کے پاس ٹھہروں گا۔ لہٰذا متعلقہ کلرک نے کھلے آسمان تلے کرسی نشیں اپنے لحیم شحیم افسر سے ملنے کا اشارہ کیا۔ اُن تک پہنچا۔ پاسپورٹ اور ویزا دکھایا۔ بولے یہ عجیب ویزا ہے۔ آخر وہاں آپ کا کون عزیز ہے جسے ملنے جارہے ہو۔ میں نے بتایا لاہور کا ہر شہری تو شہری اس کا ہر در و دیوار مجھ کو عزیز ہے۔ انہیں ملنے جارہا ہوں۔ پھر بولے خانہ پُری کے لئے بتادیجئے کہ پہلے کس کے پاس جاؤ گے میں نے جواب دیا کہ لکھ لیجئے کہ سب سے پہلے 'مشرق' کے دفتر میں جاؤں گا۔ اس کے نیوز ایڈیٹر سے ملوں گا ـــــ بولے نام کیا ہے "نام نہیں جانتا" میں نے جواب دیا "اخباروں پر ایڈیٹر کا نام چھپتا ہے، نیوز ایڈیٹر کا نہیں"، یہ خانہ پُری ہوچکی اور چائے کے پیالے کی پیش کش بھی ہوچکی تو میرے سامان کو کھولے بغیر انہوں نے مجھے آگے بڑھ جانے کو کہا۔ میں سوٹ کیس اُٹھانے لگا تو بولے لاہور کیسے جاؤ گے ٹیکسی سے یا منی بس سے۔ میرے بتانے پر کہ کُل ۲۴۰ روپے میرے پاس ہیں۔

ٹیکسی کرنے کا سوال ہی کیا ہے۔ کوئی منی بس پکڑ دوں گا۔ یہ سُنکر پاکستانی افسر نے اردلی کو بلایا اور تاکید کی کہ میرا سامان اُٹھا کر باہر کھڑی منی بس تک پہنچا دے اور بس والے کو تاکید کردے کہ مجھے لاہور اسٹیشن تک بحفاظت پہنچا دیا جائے۔

منی بس کا کرایہ اسٹیشن تک تین روپے تھا۔ ایک روپیہ سوٹ کیس کا لگا۔ بس راستہ میں سواریاں اُٹھاتی دوڑنے لگی۔ کچھ جٹیاں سوار ہوئیں۔ ماجھے کی ٹکسالی پنجابی بول رہی تھیں۔ کچھ جوان چڑھ بیٹھے۔ دفتروں میں کام کرنے لاہور جا رہے تھے۔ بس جلو اور نئے سرے سے سجے سنورے شالیمار باغ کے آگے سے گذرتے لاہور اسٹیشن پر آرکی۔ کہیں کسی سڑک پر کوئی سیاسی پوسٹر نظر نہ آیا تھا البتہ امام حسین کی یاد میں ماتمی جلسوں کے پوسٹروں کی کچھ کمی نہ تھی۔ اتنے مختصر راستہ میں بھی اپنے جذبات قابو میں نہ رکھ سکا تھا ——— خود ہی اِدھر اُدھر بیٹھوں کو بتا چکا تھا کہ ۲۳ برس بعد لاہور دیکھنے آرہا ہوں جس کسی نے سُنا وہ بھی جذبات کی رَو میں بہنے لگا



لاھور کا شالیمار باغ

وہی گلیاں وہی راستے مگر...

سن ۱۹۸۰ء کے بڑے دنوں سے کچھ پہلے کا ایک دن — امرتسر اور لاہور میں شاید ایک سے بھیگے بھیگے دن اور ایک سی بھیگی بھیگی رات کے بعد — ۱۵ دسمبر کو دھند چھٹنے کے بعد فراٹے کی ہوا۔ جاڑے کی مریل دھوپ میں واہگہ سے لاہور پہنچانے والی منی بس سے اترا۔ نظر اٹھتے ہی سامنے زائد از سو سال پرانے سٹیشن کی بلندی پر نیون لائٹ کے مرقی حروف میں چمکنے والا کلمہ پڑھنے کے بعد منی بس والے ایک نوجوان کی مدد سے ایک بالکل بند رکشا میں پردہ نشین بن کر کنکھیوں سے گرد و پیش کا محدود نظارہ کرتا، سارے گیلے اور کچھ کیچڑ والے رستہ سے گذرتا ایبٹ روڈ پر واقع وسیع دفتر "مشرق" کے پُر بہار احاطے کے باہر پان والے سٹال پر جا اترا — سارا سامان اتار لیا مگر خضر صورت سارتھی کا حق ادا کرنے کی توفیق کہاں؟ پھر بھی میٹر سے جو بنتا تھا۔ اس سے کچھ زیادہ دے اور دل کھول کر شکریہ کہہ پان والے کا رُخ کیا۔ قسم قسم کے پان، طرح طرح کے زردے اور قوام، زیادہ تر ہندوستانی، سب مسالے دیکھ دل باغ باغ ہو گیا۔ جانتا تھا کہ پان مہنگے ہیں، زیادہ نہ خرید سکوں گا۔ لیکن تمباکو رگڑنے کے لئے چونہ تو ہر وقت مل سکتا تھا۔ اسلامی ریاست کے بانی قائداعظم کی پروقار تصویر والا نوٹ دے دو پان بندھوائے۔ سب سے پہلے ملنے والوں کے لئے — دفتر "مشرق" پرانے وقتوں کا بنگلہ ہے۔ اب پچھواڑے میں بہت کچھ نیا بن گیا ہے ایک بے اولاد درویش صفت، کئی خوبیوں کے جوہر عنایت اللہ نے پودا لگایا تھا اب سینکڑوں

بوڑھے اور جوان اللہ کی عنایت سے پھل کھا رہے ہیں۔ ہزاروں دوسرے فیض پا رہے ہیں۔ سوٹ کیس گھسیٹتا اور نیوز ایڈیٹر کا پوچھتا اور انہیں غیر حاضر پا کر ایڈیٹر انچارج ضیاء انصاری کے کمرے تک جا پہنچا۔ دستک دی۔ جواب ندارد۔ سامان باہر رکھ بے دھڑک اندر داخل ہوا تو انہیں کام میں کھوئے پایا۔ بس بالکل گم۔ میں بھی بے حرکت رہا۔ پھر جو اُن کی نظریں اُٹھیں اور ہماری آنکھیں چار ہوئیں اور ہمکلام ہوئے تو پل بھر میں کھل گئے۔ آوازیں دے دے کر ساتھیوں کو بلایا اور ہم دیکھتے دیکھتے گھل مل گئے گویا دم بھر کی شناسائی نہیں، برسوں کی آشنائی ہے۔ چائے کے دور شروع ہو گئے۔ نہ میں نے اپنی



عنایت اللہ مرحوم بانی مشرق لاہور

چھٹی کا پوچھا، نہ اس کے ذکر کی ضرورت سمجھی۔ سب سے پہلے سرفراز احمد نے اپنے گھر ٹھہرنے کی دعوت دی۔ دوسرے نے اپنے ہاں لیجانے پر اصرار کیا۔ تیسرا بولا یہ شرف مجھے حاصل ہونا چاہئے۔ اسی دوران میاں نے اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے ایک افسر شری کاردار کو ٹیلیفون کرکے بتایا کہ ہمارے سٹاف کے سینئر جرنلسٹ اور اُن کے پُرانے دوست شری نامی نے اُن کیلئے کچھ تحفے بھیجے ہیں۔ کچھ پان اور لڑکیوں کے لئے کچھ چوڑیاں۔ انہوں نے چار ساڑھے چار بجے تک دفتر 'مشرق' میں پہنچنے کا وعدہ کیا۔ چائے کا دَور جاری تھا تو میں نے یہ بھی بتا دیا کہ ۱۸ کو کراچی جانا چاہتا ہوں، ہوسکے تو گاڑی میں سیٹ ریزرو کرادی جائے۔

چائے کا دَور ختم ہونے تک ریلوے میں میری ریزرویشن خاص جرنلسٹ کوٹے میں سے ہو چکی تھی۔ میں نے کرائے کے لئے سو کا نوٹ پیش کیا اور یہ کہتے ہوئے کہ ٹکٹ منگوا رکھئے میں شہر دیکھنے نکلتا ہوں چار ساڑھے چار بجے تک لوٹ آؤں گا۔ اُٹھ بیٹھا۔ موسم کُھل چکا تھا اور دھوپ کچھ کچھ کھِلنے لگی تھی۔ اتنے میں ایک مشہور خطاط عباس صاحب آن پہنچے۔ وہ بھی کچھ عرصہ پہلے اجمیر شریف کی زیارت کرنے بھارت آئے تھے اور دلی میں مختصر قیام کے دوران دفتر پرتاپ میں تشریف لائے تھے۔ اسی رات پرتاپ کی بڑی سُرخی اُنہوں نے ہی لکھی تھی۔ اگرچہ مجھ سے مِل نہ پائے تھے لیکن میرا نام سُن چکے تھے وہ بولے جہاں جانا ہے میں پہنچا دیتا ہوں اور مجھے اپنے موٹر سائکل کے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چند منٹوں میں نسبت روڈ، ریلوے روڈ، ایبک روڈ سے گذرتے جہاں قطب الدین ایبک کا مقبرہ ہے ہمارے وقتوں میں ایک پُرانی عمارت کے نیچے قبر ہوا کرتی تھی انارکلی میں داخل ہوئے۔ ہمارے دَور کے اس بارونق ترین بازار سے اکثر حریت پسند طلبہ کے بھاری جلوس اَپ اَپ دی نیشنل فلیگ ڈاؤن ڈاؤن دی یونین جیک کے فلک شگاف نعرے لگاتے گذرا کرتے تھے اسی انارکلی میں داخل ہوئے تو وہی بھیڑ بھاڑ، کھوے سے کھوا اچھل رہا تھا۔ ہر مَرد صحت کی تصویر، ہر عورت حُسن و جمال کی تجسیم دِل خوش ہوگیا —— دوکانیں مال سے اَٹی نظر آرہی تھیں ریڑھی والوں نے رستہ اور بھی تنگ کر دیا تھا اسی حالت میں آگے بڑھتے لاہوری دروازے کے چوک تک آ پہنچے۔ جہاں پُرانے وقتوں کی چھوٹی سی مسجد کی جگہ اَب ایک عالیشان مسجد نے لے لی ہے۔ میں نے عباس صاحب سے اجازت چاہی۔ کہدیا کہ ساڑھے چار بجے تک "مشرق" کے دفتر خود ہی پہنچ جاؤں گا۔ چلتے چلتے انہوں نے مجھے صبح کے سفر کی تھکن کے بعد تازہ دم کرنے کے لیئے

پھلوں کے رس کا گلاس پلا دیا اور میں پرانے دروازے کی طرف لپکا۔ داہنے طرف پھلہروں کی کچھ دکانیں دیکھ کر اپنے وقتوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ دروازے سے گذر پرانے شہر میں قدم رکھا۔ کچھ آگے بڑھا تو بائیں طرف عبدالمجید پروین رقم کی بیٹھک کا تباں پر نظر پڑی۔ لاہور میں خوشنویسوں کی بڑی بیٹھک یہی رہی ہے۔ بانگ درا، بال جبریل اور ضرب کلیم کے پہلے ایڈیشنوں کی کتابت پروین رقم نے اسی بیٹھک میں کی تھی



ہمارے وقتوں کا بیرون لوہاری دروازہ اب بھی کچھ پرانا ہے کچھ نیا۔ کچھ پرانے پھلہرے بھی ہیں۔

کوئی تیس برس گذرے پروین رقم کے شاگرد تاج زریں رقم دلی تشریف لائے تھے تو اپنے مرقع زریں کا ایک نسخہ مجھے محبت سے پیش کر گئے تھے۔ وہ میں ساتھ لے گیا تھا کہ اس فنکار سے میرے لگاؤ کی سند رہے اور بوقت ضرورت کام آوے۔ اس وقت میں جلدی میں تھا، قدم رک نہ رہے تھے ہمارے وقتوں میں اس بیٹھک کے نیچے ایک گھڑی ساز کی دوکان تھی جس پر لگے کلاک کے اوپر لٹکتے بورڈ پر پروین رقم کے ہاتھ کا یہ شعر لکھا تھا۔

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی



شاہ خطاط



منشی عبدالمجید
پروین رقم

منشی تاج الدین
زریں رقم

میں دیوانہ وار بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ایک ایک قدم میں کئی قدم اُٹھا رہا تھا۔ در و دیوار سے ہم کلام ہوتا جا رہا تھا۔ ماضی میں کھویا جا رہا تھا۔ اسی حالت میں سوتر منڈی جا نکلا۔ پھر سوچا نامی صاحب نے ایک چٹھی موہلیاں کے محلّہ میں مقیم ایک دوست کے نام دے رکھی ہے وہ بھی پہنچا دوں۔ کوچہ شامی ہوکاں کے آگے سے گذرتا محلہ موہلیاں کی طرف بڑھا۔ جہاں سُرخوں کی وہ دکان اسی طرح چل رہی تھی جہاں سے ہم بچپن میں سُرخ خرید کر لڑایا کرتے تھے کوچہ لیلے مجنوں اور کوچہ پیر شیرازی سے گذرتا اُدھر جا نکلا جہاں گوکل پنڈت کا اکھاڑہ اور اُس کے سامنے ایک مشہور جنج گھر ہوا کرتا تھا۔ گُمٹی بازار میں بُلاقی بلڈنگ کے آگے سے گذرتے پانی کے تالاب تک جا پہنچا پھر ٹوپیوں والے بازار سے گذرا۔ وہ رونق جو پہلے ہُوا کرتی تھی وہی اب بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے کوئی بھگوان داس مال بیچتا تھا اب عبدالرشید بیچ رہا ہے پہلے بے پردہ ہندوانیوں کی بھیڑ ہوتی تھی اب، بے پردہ مسلمانیوں کے ٹھٹھ تھے۔ دکاندار پہلے بھی بھین جی، کہہ کر عورتوں سے بات کرتے تھے۔ دکاندار اب بھی بھین جی کہہ کر پکار رہے تھے۔ برہم ناتھ کے شوالے کے آگے سے وچھو والی میں داخل ہوا۔ اب شوالہ کیسا ۔۔۔ ؟

متحدہ ہندوستان کو 'نیا شوالہ' کا سندیش دینے والا اس دُنیا سے جاتے جاتے برادرانِ دین کو کچھ ایسا درس دے گیا تھا کہ پُرانے شوالے بھی نہ رہے۔ تنگ بازار سے گذرتے اس عمارت کے آگے سے گذرا جہاں سناتن دھرم سبھا کا سکول اور پاٹھ شالہ ہوا کرتی تھی۔ چھیٹی جماعت تک میں اسی سکول میں پڑھا تھا۔ ہندی پڑھتا تھا۔ ابجد تو گھر پر ماں سے پڑھی تھی اب وہاں رہائش گاہیں ہیں۔ اندر ایک مندر بھی تھا۔ اُس کا کیا ہوا یہ رام جانے، کچھ آگے بڑھتا اس موڑ پر جا پہنچا جہاں کبھی "کنج دی ہٹی" ہوا کرتی تھی۔ گرمیوں میں شربت اور سردیوں میں پتنگیں بکتی تھیں بسنت سے پہلی راتوں کو عجب بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔ بچے اکثر گایا کرتے تھے ؎

کنج دی ہٹی جاواں گے
تے گُڈی ڈور لیاواں گے

بائیں طرف مُڑا جہاں کبھی اننتا شاہ حلوائی کی دکان ہوا کرتی تھی۔ اس کے آگے سے گذرتا تیلیاں دی کھوئی کے باہر سے ڈاکٹروں کے محلّہ میں داخل ہوتے قدم رُک گئے۔ پہلے کبھی وہاں

ایک ہومیوپیتھ بیٹھا کرتا تھا۔ اَب بھی ایک ہومیوپیتھ کے کلینک کا بورڈ پایا۔ کلینک کے باہر وہی پُرانا لال زنگا لیٹر بکس جو پہلے تھا۔ اَب بھی خاموش کھڑا تھا مجھے دیکھ گویا پُکار اُٹھا۔

ع
نہیں منّت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زُبانی ہے زُباں میری
اُٹھائے کچھ وَرق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

کچھ اور آگے بڑھا اس تنگ راستہ کے دونوں طرف کبھی لاہور کے مشہور ترین ڈاکٹروں ڈاکٹر بیلی رام، ڈاکٹر گوپی چند بھارگو، ڈاکٹر نہال چند اور ڈاکٹر شنکر داس مہرہ نے پریکٹس کی تھی موخر الذکر تینوں ایک ہی کلینک میں یکے بعد دیگرے ہزاروں لاکھوں مریضوں کو شفا بخشتے رہے تھے۔ اُن کے کلینک کے پڑوس میں پنڈت جواہر لال نہرُو کے ننھال تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو کی شادی اگرچہ راولپنڈی میں ہوئی تھی لیکن شریمتی سروپ رانی بچپن میں 'بسو' کے نام سے اسی محلہ میں کھیلا کرتی تھی۔ اَب سب کچھ ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ ہمارے زمانے کے کنجر کھلہ سے آگے نکین دی حویلی کے پچھواڑے میں واقع سر گنگا رام ہسپتال اَب لبِ سڑک ہے۔ اِس کے پچھواڑے



بٹوارے کے وقت جلتے ہوئے لاہور کا ایک اندوہناک منظر

میں آریہ سماج وَچھو والی کا شاندار مندر ہوا کرتا تھا۔ اس کا حشر نامعلوم! جون تا اگست ۴۷ء جب خنجر بکف اور مشعل بدست فرزندانِ توحید جوشِ جنوں میں اندھے ہو کر رام کے بیٹے لو سے آباد شہر کے قدیم کافروں کو خاک و خون میں تڑپا چکے اور شاہ عالمی دروازے کے محلّے کے محلّے جلا کر بچے کچھوں کو بھگا چکے تو اُس کے سوائے چارہ ہی کیا تھا کہ نیم شکستہ حصّوں کو بھی گرا کر رنگ محل تک سڑک کو کشادہ کر دیا جائے ، یہ بازار دلّی کے چاندنی چوک بلکہ حیدرآباد (دکن) کے پتھر گٹی سے بھی زیادہ چوڑا ہے لیکن مال کی نمائش میں چاندنی چوک کا تو خیر مقابلہ ہی کیا ، پتھر گٹی کا بھی پاسنگ نہیں، دونوں اطراف تین تین منزلہ مارکیٹیں ہیں۔ اب دروازے کا نام ونشان نہیں۔ میں مارکیٹ کو دیکھتا اندرون شہر سے باہر نکلا تو بھائی منوہر لال کے مندر کا سنہری کلس سہ پہر میں نیلگوں آسمان تلے جھلملاتا نظر آیا۔ جنم اشٹمی کی رات کو یہ مندر بُقعہ نور بنا ہوتا تھا۔ ظلمت کدہ کو حرارتِ ایمانی سے منوّر کرنے والوں نے اُس کو بے چراغ کر دیا۔ شمع رسالت کے پروانوں نے اس کی شمع گُل کر دی ؂

مندر کے اندر کیا ہو رہا ہے یہ میں نے جاننے کی کوشش نہ کی ؂

بُلبل نے آشیانہ چمن سے اُٹھا لیا\
اُس کی بَلا سے بُوم رہے یا ہُما رہے

اس مندر کے سامنے پچھے شاہ کا خیراتی آیورویدک ہسپتال تھا۔ اب کوئی یونانی دواخانہ ہے وہ جو چھوٹی سی نہر شہر کے کچھ دروازوں کے باہر سبزہ زاروں کو سیراب کرتی ہوئی اس مندر کو چھوتی تھی۔ نجانے کیوں بند کر دی گئی ہے ، بچے سارا دن نہایا کرتے تھے ، لوہاری دروازے کے باہر والی مسجد کے نمازی اُس کے پانی سے وضو کرتے تھے اور جب کبھی میونسپل نل بند ہوتے تھے تو بھائی منوہر لال کے مندر کی مورتیوں کو اسی کے پانی سے اشنان کرایا جاتا تھا۔

چار بج رہے تھے اور مجھے جلد سے جلد ایبٹ روڈ پر مشرق کے دفتر پہنچنا تھا۔ میں شاہ عالم مارکیٹ سے ریلوے روڈ کی طرف بڑھتے بانسوں والے بازار سے گذرا۔ دائیں طرف رتن چند کے تالاب کے احاطہ میں واقع مندر کا کلس بھی نظر آیا۔ باہر نمک منڈی پہلے بھی تھی اب بھی ہے۔ بائیں طرف بانسوں کی دوکانیں تھیں جس کے پیچھے کرشنا گلی ہے۔ ریلوے روڈ کے چوراستے سے نسبت

روڈ پر ہولیا۔ دائیں طرف بھارت انشورنس کمپنی کا دفتر ہوتا تھا۔ اب کچھ نہیں ہے۔
چیمبرلین روڈ اور نسبت روڈ کے چوراستہ پر امر اُوہ سنگھ کی مٹھائی کی مشہور دوکان تھی، اُس کے ساتھ پرتاپ بلڈنگ ہوا کرتی تھی جہاں میں نے کام شروع کیا تھا اور جس کی بالکونی سے اُن جلوسوں کا نظارہ کیا تھا۔ جو مارچ ۱۹۴۷ء میں وزارتِ اعظمیٰ سے متحدہ پنجاب کے آخری وزیر اعظم سردار خضر حیات خاں ٹوانہ کے استعفے سے پہلے مسلم لیگ کے زیرِ اہتمام نکلا کرتے تھے۔ جلوس کیا ہوتے تھے۔ بےعقل انسانی سروں کے دریا موجزن ہوتے تھے۔ مرد ہی نہیں بے بُرقع نوجوان لڑکیاں بھی سینکڑوں کی تعداد میں شامل ہوتی تھیں۔ سب کی زبان پر بس ایک ہی نعرہ تھا۔

"دل کی تمنّا پاکستان
لے کے رہیں گے پاکستان
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ

فروری ۱۹۴۷ء کے آخر میں ایک روز خضر کے استعفے کے چرچے تھے۔ الہڑ نوجوان جوشِ جہاد میں اِس ٹوانہ راجپوت کو مرعوب کرنے کے ارادے سے۔ "سچا پیر جُتی دا، خضر پُتر کُتی دا" کے فلک شگاف نعرے بلند کر رہے تھے۔ اچانک کسی نے کہہ دیا کہ خضر مسلم لیگ میں شامل ہو گیا ہے بس پھر کیا تھا۔ بات کی بات میں کسی نے یہ نعرہ گھڑا۔" تازہ خبر آئی اے۔ خضر ساڈا بھائی اے۔" اور پھر فضا اسی نعرے سے گونجنے لگی، تاوقتیکہ کسی نے اس کی تردید نہ کردی۔ اور پھر وہی "سچا پیر جُتی دا، خضر پُتر کُتی دا" کی رَٹ پر لنگی تہذیب کا ناچ ہونے لگا۔
دفتر 'مشرق' میں کاردار صاحب پہلے سے موجود تھے۔ تحفے اُن کے حوالے کئے انہوں نے ایک شام ساتھ گذارنے کی دعوت دی۔ میں نے اُس کے لئے شکریہ ادا کیا لیکن صاف صاف کہہ دیا کہ اِس مَلنگ کا کچھ بھروسہ نہیں کس تکیئے پر شام گذرے اور کس گُدڑی میں شب بسری ہو۔ میرا اِس رات کا میزبان پہلے ہی میرا سامان لے کر گھر جا چکا تھا۔ اور میں 'مشرق' کے دفتر میں کچھ ماضی میں محو اور کچھ وقت کٹی میں مصروف تھا۔ آخر ایک صحافی نے ـــــ جو بھوپال کے رہنے والے حضرت خیالی

نکلے۔ مجھے اپنے موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھایا، دُوسرے موٹر سائیکل پر دو اور صحافیوں نے ساتھ بٹھایا اور ہم جرنلسٹ کالونی کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاں میرا رات بھر کا ٹھکانہ تھا۔ ایک اچھی کالونی سے گذرتے اُس کا نام پوچھا تو معلوم ہوا سمن آباد ہے۔ اچانک خیال آیا کہ ہمارے ایڈیٹوریل سٹاف کی ساجدہ زاہدی نے اس کالونی میں اپنے بھائی کے نام چھٹی دے رکھی ہے۔ لگے ہاتھوں یہ کام بھی ہو جائے۔ ایک دوکان سے فون کرکے مکان کا صحیح محلِ وقوع معلوم کیا اور ہم سب نے وہاں پہنچ کر دستک دی۔ اتفاق سے زاہدی صاحب موجود تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور بہن کی چھٹی بھائی کے حوالے کی۔ اس میں کیا لکھا ہے تو مجھے معلوم نہیں لیکن زاہدی صاحب کے حُسن سلوک کے ہم سب قائل ہو گئے۔ انہوں نے دوسرے روز کھانے کی دعوت دی۔ میں نے اس محبّت و خلوص کے لئے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن وہی پہلی بات دوہرادی کہ کیا کہہ سکتا ہوں کل کیسے گذرے۔

میزبان کے مکان پر پہنچے۔ ہم رکابوں نے اجازت مانگی۔ سرفراز ڈرائنگ کم ڈائننگ رُوم میں لے گیا۔ دن بھر کھانے کی کیسے شدھ رہی تھی۔ نئے یاروں نے جامِ اُلفت پلا پلاکر پیاس تو پیاس بھوک تک مٹا دی تھی۔ دسترخوان پر مختلف کھانے پہلے سے چُنے جا چکے تھے۔ بس میری انتظار میں گھر والے بیٹھے تھے۔ میں نے کہہ دیا مجھے گوشت سے پرہیز نہیں لیکن کچھ شوق بھی نہیں۔ کہنے لگے سبزیاں بھی بنی ہیں۔ کھانے کی میز سے اُٹھ صوفے پر آن بیٹھے۔ سبز چائے کا دَور شروع ہوا تو ایک نوجوان بھی آ گیا۔ میرے میزبان کا کوئی واقف کار تھا۔ میری آمد کی خبر محلّے میں نکل چکی تھی۔ وہ ملنے آیا تھا۔ سرفراز تو میرے سونے کے انتظام میں لگ گیا اور یہ جوان اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا کہ میں پیشہ سے وکیل ہوں۔ کچھ صحافت سے بھی لگاؤ ہے۔ مسلم لیگ کی سینٹرل کمیٹی کا ممبر ہوں۔ گھر والوں کا کچھ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے، دُنیا گھوم چکا ہوں اور زمانہ دیکھ رہا ہوں اور سیاسیات کا طالب علم ہوں۔ ذرا بتائیے تو سہی کہ کشمیر اسمبلی کی پچیس سیٹیں کب پُر ہوں گی ؟ جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ ریاست جمّوں و کشمیر کا اپنا آئین ہے۔ اُن میں سے بھی بیشتر یہ نہیں جانتے کہ از روئے آئینِ ریاست کشمیر اسمبلی کی کُل ایک سو سیٹیں ہیں جُناؤ صرف ۷۵ کا ہوتا ہے۔ باقی ۲۵ پاکستانی مقبوضہ علاقہ کے لئے مخصوص ہیں کہ جب کبھی ریاست کی اگست ۱۹۴۷ء والی حدود

بحال ہوں تو ان علاقوں کو نمائندگی مل سکے۔میں نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ سیاسی حدود بدلتی رہتی ہیں۔کل کیا ہو کون جانے۔فقط اتنا جانتا ہوں کہ جب کبھی ان علاقوں کے لوگ دل سے چاہیں گے اور اپنی آرزو کی تکمیل کی قیمت چکانے کو تیار ہوں گے وہ کشمیر سمیت پورے ہندوستان کے جمہوری اداروں سے فیض پا سکیں گے۔"

"لیکن آخر تمہیں کشمیر سے دلچسپی کیا ہے؟" میں سوال کر بیٹھا۔

بولا "میرے گھر والے کارگل میں رہتے تھے۔اَب بھی کچھ عزیز وہاں ہیں۔میں اپنے میٹھے پیاروں سے ملنے وہاں جانا چاہتا ہوں لیکن اجازت نہیں ہے۔کیا آپ وہاں جانے کی مجھے اجازت دلا سکتے ہیں۔" میں نے اُسے سمجھایا کہ نوکر شاہی دونوں طرف ایک سی ہے۔یہاں اور وہاں قواعد وضوابط انسانوں کی سہولتوں کے لئے نہیں بنائے گئے۔انسانوں کی ضرورتوں کو قواعد وضوابط کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔بہرحال ہمارے وزیرِ خارجہ کے نام چٹھی لکھ دو۔اگر ان کی نظرِ التفات ہو گئی تو شاید آپ کی دلی مُراد بر آئے اُس نے میرے پاکستان سے نکلنے تک کچھ لکھ کر دینے کی زحمت نہ کی۔

تیسرا سوال اس طالب علم سیاست نے یہ کر ڈالا کہ مرارجی ڈیسائی نے جو یہ کہا ہے کہ روسی لیڈروں نے اُنہیں وہ کہا تھا اس کی حقیقت کیا ہے۔میں نے یہ سوال بھی یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہمارے ملک میں ہر اک کو ہر بات کہنے کی اجازت ہی نہیں حق حاصل ہے۔غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے یہ بھید ۳۰ برس بعد ہی کھل سکتا ہے۔جب سیاست تاریخ میں بدلنے لگتی ہے اور خفیہ دستاویزیں شائع ہوتی ہیں۔تب تک ہر سیاسی لیڈر کی بات صرف سیاست سمجھو تو کبھی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوگے اور بھی کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔اتنے میں ایک نے آکر خوش خبری سُنائی کہ قریبی مکان میں چند جرنلسٹ انتظار میں بیٹھے ہیں۔ذرا تشریف لے چلئے وہاں دو چار اخباروں کے لوگ موجود تھے۔کچھ میٹھے پکوان کا انتظام تھا چائے اور کافی اور مشروبات کا پُر تکلف اہتمام تھا۔علیک سلیک کے بعد ایک بولا۔پڑوسیوں میں جنگ نہیں ہونی چاہئے۔اس سودے میں سوائے نقصان کے دھرا ہی کیا ہے۔دوسرے نے کہا کہ اگر جیتے علاقے بالآخر واپس ہی کرنے ٹھہرے تو یہ مارا ماری کیسی۔نا بھئی جنگ نہیں ہونی چاہیئے۔ہماری تمام تر توجہ اَب ترقیاتی کاموں میں مرکوز ہونی چاہیئے۔بھارت کو بھی چاہیئے کہ روس سے نئے نئے جنگی طیارے خرید کر

ہمیں مرعوب نہ کرے۔ بہت ہو چکا اب ہمیں دوستی اور امن چاہیئے۔

میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ بھارت جمہوری مزاج اور جمہوری ادارے رکھتا ہے۔ بے خوف وخطر سب کچھ کہنے اور چھاپنے کی اجازت ہے۔ سیکولر ریاست کی رنگ برنگی سیاست کا کوئی ایک امام نہیں۔ ہر گروہ کا اپنا امام ہے اور ہر امام اپنے گروہ کو نہیں بلکہ پورے ملک کو جوابدہ ہے۔ سب امام مختلف مسئلوں پر اپنی رائے رکھتے ہیں۔ لیکن اس رائے پر سب متفق ہیں کہ جنگ مسائل کا حل نہیں۔

اِدھر اُدھر کی کچھ اور باتیں ہوئیں۔ سیاست پر بحث میرا منشا، مدعا و مقصد نہ تھا۔ دوستی کے چرچوں میں کافی وقت اُڑ گیا۔ آدھی رات کو یار زندہ صحبت باقی کہہ کر اُن سے اجازت چاہی میزبان کے ساتھ لوٹ آیا۔ پھر تھکن سے چور بستر پر لیٹا سوچا دن بھر کی کہانی ڈائری میں نوٹ کر لوں۔ کچھ لکھنے کے کام آئے گا۔ پھر یہ سوچ کر کہ یادداشت کے لئے کچھ لکھ رکھنا اور پھر لکھنا۔ لکھنا کیسا؟ لکھنا وہی جو صرف یاد سے لکھا جائے جو کچھ دیکھا سُنا جائے اُسے دماغ میں محفوظ کر لیا جائے اور دلی لوٹ کر جب لکھا جائے تو قلم برداشتہ لکھا جائے۔ بس یہی سوچ کر اور گذرے دن کو ایک خواب کی تعبیر جان، سو گیا خوابوں کی دُنیا میں کھو گیا۔



۱۹۴۷ء کا ایک اور منظر — "گلیاں اُجڑ گئی ہیں مگر پاسباں تو ہیں"

لاھور نامہ

حسبِ عادت صبح ۴ بجے نیند کھلی تو اندصیاری رات باقی تھی۔ تازہ اخبار ہاتھ نہ لگے تو پچھلے اخبار دیکھنے لگا۔ کچھ وقت کٹا تو قریبی مسجد سے فجر کی اذان ہوئی۔ پہلے ایک آواز کان میں پڑی پھر دوسری پڑنے لگی۔ ہر مازنا پر لگے لاؤڈ اسپیکروں سے پانچوں وقت اللہ کے بندوں کو سر بسجود ہونے کے لئے پکارا جاتا ہے۔ کتنے لوگ مسجدوں کا رُخ کرتے ہیں یہ جاننے کی ضرورت نہ سمجھی۔ بعد ازاں ایک روز جب ایک صاحب سے ذکر چھڑا تو کہہ اُٹھے "جنیاں اُچیاں بانگاں، اُونیاں مسیتاں خالی" یعنی اذانیں جتنی اُونچی مسجدیں اُتنی ہی خالی۔

عادت سے مجبور اس سردی میں بھی جب میں نے نہانے پر اصرار کیا تو گرم پانی کا انتظام ہوگیا۔ ناشتہ سے فارغ ہوا تو وہی بھوپالی عرف خیالی صاحب اپنے سکوٹر پر بٹھا دفتر مشرق کی طرف چل دیئے۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ مجھے ضابطہ کے مطابق لاہور پہونچنے کے ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر پولیس ہیڈ کوارٹر میں اپنی آمد کا اندراج کرانا تھا۔ اس جرنلسٹ کالونی میں کچھ اور جرنلسٹوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ "امروز" کے "نوائے وقت" کے اور "پاکستان ٹائمز" کے۔ سب سے علیک سلیک کرتے ہم آگے بڑھے۔ ایک سڑک سے گذرتے جب خیالی صاحب نے کہا کہ یہ دیکھئے بائیں طرف فاطمہ میڈیکل کالج ہے تو ایک دم میری زبان سے نکل گیا۔ یہ وہی تو نہیں جو پہلے بالک رام میڈیکل کالج تھا جہاں تقسیم سے پہلے میں نے فساد کے زخمیوں کے لئے پہلی بار خون دیا تھا۔ بولے ہاں وہی ہے۔ پھر چیئرنگ کراس تھانہ کے آگے سے مال روڈ کو پار کرتے اسمبلی ہال پر نظر پڑی۔ دائیں طرف فلیٹی ہوٹل کی جگہ ایک کئی منزلہ انٹرنیشنل ہوٹل نے لے لی ہے۔ سامنے وکٹوریہ کا بُت ہوتا تھا۔ اب صرف چھتری ہے۔ ساتھ ہی عہدِ بھٹو میں منعقدہ اسلامی چوٹی کانفرنس کی یادگار ہے۔ اُونچی نشست سے نہیں، ایک گڑھے سے اُٹھی ہے۔ بلندی پر خطِ کوفی پر کچھ لکھا ہے۔ یادگار کیا ہے؛ خوشنما ہے۔ بھدا کرنے کی کسرت ہے۔ اس پنجاب اسمبلی کی کارروائی رپورٹ کرنے کچھ دن مجھے بھی جانا پڑا تھا۔ تب ائرکنڈیشننگ کا طریقہ معلوم نہ تھا۔ ہال کو ٹھنڈا کرنے کے لئے تہ خانے میں برف کی سلیں ڈالی جاتی تھیں۔ غیروں کے راج میں بھی کیسی کھُل کر بحث ہوتی تھی۔ ایک طرف۔ "ہے ڈیڑھ فٹ کا طرہ قومی نشاں ہمارا" گا پر فخر کرنے والے یونینسٹ اور دار ورسن کی آزمائش سے گذرنے والے گاندھی ٹوپی والے اور نیلی پگڑیوں والے اور دوسری طرف "خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا" فخریہ گانے والے جناحی کیپ پہنے۔

اب اپنے ہی راج میں اس اسمبلی کے باہر ایک بورڈ پر "مارشل لاء زون اے" پڑھ کر بہت دُکھی ہوا۔ بنوکِ سنگین جمہوری ادارہ ختم، محض عمارت کی حفاظت کے لئے سنگین تانے بندوقچی تعینات تھے۔

دفترِ مشرق سے چیف رپورٹر عمر سلیم کو لے پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ ایک وضعدار اور رعب دار افسر شری بٹ نہایت خلوص سے پیش آئے۔ چند منٹ میں خانہ پُری کرادی۔ اور گرم چائے کی پیالی ساتھ پلادی۔ عمر کی یہ تجویز میں نے بخوشی مان لی کہ وہ رات اُس کے گھر اندرونِ شہر گذرے گی۔ پھر میں گھومنے اور ملنے ملانے نکلا۔ چند چٹھیاں لکھنے والوں کے دوستوں اور عزیزوں کو پہنچائیں۔ دو تین چٹھیاں اُن کی بیویوں کے نام تھیں جو موجودہ حالات میں وطنِ عزیز لوٹنا خالی از خطرہ نہیں سمجھتے اور مناسب وقت کے انتظار میں دوسرے ملکوں میں وقت کاٹ رہے ہیں۔ یوں ہرکارے کا کام کرتا ایک ایسی جگہ پر جا پہنچا۔ جہاں کچھ ترقی پسند بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ اُن میں سے ایک کو ایک سانجھے ساتھی کا رقعہ دِکھایا تو گویا اس کے دل کی کلی کھِل اُٹھی ایک رقعہ کافی تھا سب سے گھُل مِل جانے کے لئے۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ پورے پاکستان میں اب ایک بھی ترقی پسند اُردو رسالہ نہیں رہا۔ سب بند کر دیئے گئے ہیں۔ بہر حال یہ جان کر خوشی ہوئی۔ کہ اربابِ بے لگام اقتدار کے ہزار جتن کے باوجود مزدور تحریک مری نہیں صرف دَبی ہوئی ہے۔ اگرچہ اخبارات میں آزمودہ لیڈروں کا نام نہیں چھپ سکتا تاہم زمانہ ساز قسم کے نقلی مزدور لیڈروں کی اصلیت سے مزدور خوب واقف ہیں۔ اگرچہ آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی قابلِ تعزیر ہے۔ تاہم اللہ کے شیر وہی کہلاتے ہیں۔ جو روباہی نہیں جانتے۔ میں نے ریلوے مزدور لیڈر ابراہیم مرزا کا پوچھا کہ اپنے لڑکپن میں اُن کی زبان سے "ہم ایسی آزادی کب چاہیں مزدور کا جس میں راج نہ ہو"، سُنا کرتے تھے بولے۔ "اُن کا دامن بدستور بے داغ اور ان کا نام آج بلند تر مقام رکھتا ہے ہر کوئی دِل سے ان کی



مزدور لیڈر مرزا ابراہیم

عزت کرتا ہے انہیں مل آؤ، وہی مغلپورہ میں ریلوے مزدور یونین کے پرانے دفتر میں پاؤ گے"۔ میں نے سندھی خاں کا پوچھا کہ ہمارے وقتوں میں ان کا بھی ایک نام تھا۔ بولے کہ بینائی کھو چکے ہیں اگرچہ چشمِ بصیرت قائم ہے۔ انہیں بھی مل آؤ۔ صد حیف میں دونوں کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ دیکھیں پھر کب جانا ہوتا ہے۔

یاروں نے یہ بھی بتایا کہ بھٹو پارٹی کا 'مساوات' مدت سے بند پڑا ہے۔ اور اس کے سینکڑوں ملازم، جرنلسٹ اور نان جرنلسٹ دَر دَر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ میں نے آزادیٔ صحافت کے



مساوات کے ساتھیوں کی حمایت میں ہونے والے ستیاگرہ کا ایک منظر

بارے میں کچھ اور جاننے کی خواہش ظاہر کی تو یاروں نے راستہ سجھا دیا۔ میں نے سب سے اجازت لی اور اگلی منزل کا رُخ کیا پاکستان کے سب سے سینئر جرنلسٹوں میں سے ایک کی چوکھٹ پر حاضری دی وہ قید و بند کی آزمائش سے گذر چکے ہیں۔ جب بتایا کہ "پرتاپ" کا میں نیوز ایڈیٹر تو ہوں ہی، انڈین فیڈریشن آف ورکنگ جرنلسٹس کا سیکریٹری جنرل بھی ہوں۔ تو نہایت محبّت سے بٹھایا اور فرمایا کہ خوش قسمت ہو جو ایسے ملک کے صحافی ہو۔ جہاں حکومتِ وقت کے خلاف سب کچھ لکھ سکتے ہو۔ یہاں کا باوا آدم نرالا ہے۔ سیاست تباہ ہو چکی ہے۔ اور ریاست بربادی کی دہلیز تک پہنچ چکی ہے۔ "مساوات" کے جرنلسٹوں اور اُن کا ساتھ نبھانے والوں کو کن کن آزمائشوں سے گذرنا پڑا۔ اس کی تفصیل بیان کی۔ پروٹسٹ کرنے والوں کو رموزِ ریاست سے بے بہرہ فوجی افسروں نے حق نمک ادا کرنے کے لئے کس سرعت سے سماعت کے بعد کس انداز میں اور کیسی کیسی سزائیں سنائیں، یہ بھی ستایا۔

کہنے لگے آخر سیاہ و سفید کے مالک کی ایک پریس کانفرنس کے خاتمہ پر فلاں جرنلسٹ نے جرأت سے کام لیتے ہوئے یہ کہہ ہی ڈالا کہ جناب صدر صاحب! فلاں جرنلسٹ بدستور جیل میں ہے وہ تو بہت ہی نیک انسان ہے تحریک پاکستان میں پیش پیش رہا ہے اُس کی رہائی کی درخواست ہم کُل صحافیانِ پاکستان کی متفقہ درخواست سمجھئے۔ صدر صاحب اس معتوب اور مقید جرنلسٹ کا نام سنتے ہی بھڑک اُٹھے اور پھر کتا بازو لہرا کر بولے " اگر میں پھونک ماردوں تو اُس کا کہیں پتہ نہ لگے۔ غنیمت جانو کہ آہنی سلاخوں کے پیچھے محفوظ ہے"۔ اسی دم دار جرنلسٹ نے پھر عرض کی۔ جناب والا! بے شک آپ کی پھونک میں بے پناہ قوّت ہے آپ ایک دم میں اس کا دم نکال سکتے ہیں لیکن سوال پھونک مار کر اُڑانے یا دم نکالنے کا نہیں، آزادیٔ صحافت کا ہے، دُنیا بھر میں پاکستان کی بدنامی ہو رہی ہے۔ ملک ملک کے جرنلسٹ ہمارے نظامِ وقت کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ ازراہِ خدا کچھ کیجئے اور اس جرنلسٹ کو رہا کر دیجئے۔ صدر نے یہ درخواست بھی اَن سُنی کر دی۔ وہی جرنلسٹ پھر بول اُٹھا! جنابِ صدر میں نے اپنی صحافتی زندگی میں اس ملک کے آٹھ صدر دیکھے ہیں میرا خیال نہیں کہ میں آخری صدر سے ہمکلام ہوں" صدر صاحب کچھ کہے بغیر اُٹھ کر چلے گئے۔

اسی جرنلسٹ نے یہ بھی بتایا کہ پاکستانی اخبارات کی ساکھ ختم ہو چکی ہے۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ لوگ اپنے ملک کے حالات جاننے کے لیے دُوسرے ملکوں کے ریڈیو بالخصوص بی بی سی سُنتے ہیں۔ آدھا پون گھنٹہ وہاں گذارنے کے بعد میں دفتر مشرق لوٹ آیا۔ اور پھر وہاں کے

لاہور نامہ

ایک جرنلسٹ کو ساتھ لے پاکستان ٹائمز اور امروز کے دفتر جا پہنچا۔ یہ عمارت پہلے ٹربیون کی ہوا کرتی تھی۔ کشادہ سیڑھیاں چڑھتے کچھ ایسے نعرے کانوں میں پڑے جو اپنے ملک میں اکثر لگاتے اور سنتے رہتے ہیں۔ پہلی منزل کی کھلی جگہ پر میٹنگ ہو رہی تھی۔ ساتھی نے بتایا کہ یہ یونین کا جلسہ ہے۔ کوئی آتش بیان لیڈر کنجشک فرومایہ کو شاہین سے لڑانے کی بات کر رہا تھا۔ پہلے تو میرا بھی دل چاہا کہ بھری سبھا میں شامل ہو جاؤں اور کچھ سنوں اور کچھ سنا دوں، پھر کچھ سوچ چپ چاپ آگے نکل گیا۔ ساتھی نے کچھ لوگوں کو بتایا کہ میں کون ہوں تو وہ مجھے بٹھلانے کے لئے ساتھ ہو لئے۔ کسی کمرے کی طرف لے جا رہے تھے لیکن میری نظر "امروز" ایمپلائز یونین کے دفتر والے کمرے پر ٹک گئی اور یہ کہہ کر اندر داخل ہو گیا کہ یونین ورکر کو یونین کا دفتر مل جائے اور کیا چاہئے۔ دیکھتے دیکھتے جلسہ برخاست۔ ہمارے اس کمرے میں جمگھٹ ہو گیا۔ مجھ سے انڈین فیڈریشن آف ورکنگ جرنلسٹس اور آل انڈیا نیوز پیپر ایمپلائز فیڈریشن کے آئین اور تنظیم کے بارے میں پوچھنے لگے۔ چائے کے دور شروع ہو گئے اور ہم سب یوں گھل مل کر باتیں کرنے لگے گویا میں وہیں کا ٹریڈ یونین ورکر ہوں۔ وہی مسئلے جو یہاں مزدوروں، ملازموں کو درپیش ہیں، وہاں بھی ہیں۔ وہی بعض منیجمنٹوں کا ڈھول ڈھپا جو یہاں نظر آتا ہے، وہاں بھی ہے۔ وہی مہنگائی کا رونا جو یہاں ہے وہاں بھی سنا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں سڑکوں بازاروں میں مظاہرے ہوتے ہیں ہڑتالیں اور گھیراؤ ہوتے ہیں۔ افسر بات نہ سنیں تو وزیروں تک بے روک رسائی ہو سکتی ہے۔ وہ بھی نہ سنیں تو پارلیمنٹ میں معاملہ اٹھایا جا سکتا ہے وہاں یہ سب ممکن نہیں ہے وہاں تو

بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ہے

اسی کمرے میں ایک خوش شکل، خوش وضع اور خوش گفتار خاتون بھی تھیں کہنے لگیں کہ میں یونین کی نائب صدر رہ چکی ہوں، خوب تھیں جب سگریٹ کا کش لگا کر دھواں اڑاتیں تو دلی یونین آف جرنلسٹس کی سابق جنرل سیکریٹری اور انڈین ایکسپریس کی اسسٹنٹ ایڈیٹر مس مدھو ہتا مجمدار کی صورت میری آنکھوں کے سامنے آ جاتی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ وہاں گذارنے کے بعد مال روڈ کے ایک ریستوران میں پہنچا۔ ایک دوست کی چٹھی پہنچانی تھی۔ جس میں لکھا تھا کہ اگر سنتوش مانگے تو پانچ سو روپے دیدینا۔ مجھے روپے کی ضرورت نہ تھی اس لئے ان کے اصرار کے باوجود میں نے کچھ قبول نہ کیا۔ ہاں دوسرے روز پھر ملنے کا

وعدہ ضرور کر آیا۔

شام ہونے لگی تو عمر سلیم نے پوچھا اب کیا پروگرام ہے میں نے عرض کی کہ لاہور آکر اُستاد دامن کے درشن نہ کروں یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہنے لگے انتظام ہو جائے گا۔ عمر سلیم اور ایک جرنلسٹ کے ساتھ جسے پیار سے کئی ساتھی ہنسی لال پکارتے ہیں۔ ہم ایک بڑی موٹر میں سوار ہوئے کچھ ٹھنڈی ہواؤں کے مزے لوٹتے ٹکسالی دروازے کے باہر ایک منہدم مکان کی ایک کوٹھری کے سامنے جا کر رک گئے عمر نے دستک دی جواب ندارد پھر ہنسی لال آگے بڑھے اور آواز لگائی — پیر و مرشد — اُستاد نے دروازہ کھولا۔ کوٹھری کیا غار سمجھئے ہر طرف سینکڑوں کتابوں کے انبار تھے۔ اُستاد کی چارپائی کے ساتھ ایک کتابوں سے اَٹی میز پر ٹیبل لیمپ روشن تھا دو تین کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ ساتھیوں نے روایتی انداز میں پگڑی باندھے اُستاد سے میرا تعارف کرایا۔ میں نے عرض کی کہ سن چوالیس، پینتالیس، چھیالیس میں آپ کا کلام سنتا رہا ہوں۔ یہ سُن وہ بغلگیر ہو گئے اور ہم دونوں آبدیدہ، سسکیاں لینے اور آہیں بھرنے لگے۔ چند منٹوں تک یہی حالت رہی۔ حرکت نہ تھی جُنبش نہ تھی آخر الگ ہوئے اور انہوں نے چارپائی پر اپنے ساتھ بٹھا لیا کہنے لگے کہ دُنیا میں ہزاروں پیر پیغمبر آئے ہیں، نبی بھی آئے ہیں، بھگوان بُدھ بھی آئے ہیں۔ رِشی منی بھی آئے ہیں۔ اس دَور میں گاندھی ایسے سنت بھی آئے ہیں، سب نے انسانوں کو انسانیت کا دَرس دیا ہے لیکن کیا بات ہے کہ انسان پھر درندے کا درندہ ہے جہاں موقعہ ملتا ہے انسانیت کا جامہ اُتار درندگی کا ننگا ناچ دکھانے لگتا ہے۔ آخر اس مسئلہ کا حل کیا ہے ؟ کچھ سمجھ نہیں آتا۔ بہت کچھ کہتے رہے مگر سب کچھ کہنے کا مطلب یہی تھا کہ آخر انسان انسان کب بنے گا۔ بات چیت جاری تھی تو انہوں نے سرہانے رکھے ایک بڑے لفافے سے کھاجا نکال میز پر پڑی رکابی میں اُلٹ دیا کہنے لگے کھاؤ ہم سب دلنے



سارے پاسے موجاں ای موجاں
پاکستان وِچ فوجاں ای فوجاں
اُستاد دامن

چنتے گئے اور اُستاد اپنی زندگی کے واقعات اور مُلک مُلک کے حالات اور دُنیا بھر کے معاملات پر بولتے گئے رکابی خالی ہوگئی تو ایک مٹھی اور خشک میوہ جات انڈیل دیئے۔ وہ بھی ختم ہوگئے تو ایک مٹھی اور انڈیل دی۔ یکایک کسی کا غلط ہاتھ پڑنے سے رکابی اُلٹ فرش پر جا گری اور بادام اور اخروٹ اور کشمش کے دانے بکھر گئے۔ میں چننے لگا تو بولے "رہنے دے" میں نے پوچھا کیوں؟ تو بولے یار کھائیں گے" وہ یار کون ہیں"؟ میں نے سوال کیا تو بولے "چوہے" میں نے کہا کہ یہ چوہے کیوں یار بنالئے تو بولے کھا جا نہ کھلاؤں گا تو کتابیں کھا جائیں گے۔ روٹی بناتا ہوں تو اُنہیں روٹی کھلا دیتا ہوں۔ برفی کھانے کے لئے لاتا ہوں تو اُنہیں برفی پیش کر دیتا ہوں اور کوئی شاگرد بادام، اخروٹ وغیرہ دے جائے تو ان کو یہ بھی کھلا دیتا ہوں اُن کا پیٹ بھرا رہتا ہے میری کتابیں بچی رہتی ہیں۔"

کہنے لگے "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میں نے گیتا پڑھنے کے لئے سنسکرت بھی پڑھی تھی، سُنا ہے ہندوستان میں اس کے کیسٹ تیار ہوئے ہیں۔ منگوانا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کی بھجوانے کی کوشش کروں گا۔ میں نے دلی آئے ہوئے 'مشرق' کے جرنلسٹ رشید صدیقی کے ہاتھ لتا کی آواز میں گیتا کا ایک کیسٹ بھیجدیا

پھر میں بول اٹھا۔" استاد! خواجہ دِل محمد نے " دل کی گیتا " لکھی تھی وہ بھی تو اچھا منظوم ترجمہ ہے۔ جواب میں بولے گیتا کی روح میں کون داخل ہوسکتا ہے۔ خواجہ دِل محمد تو ترجمہ کی مشین تھے ادھر ایک زبان کی کتاب ڈالی اُدھر دوسری زبان کی کتاب نکال لی۔ ایک گیتا ہی کیا خواجہ صاحب نے تو جپ جی صاحب اور نہ جانے کس کس کتاب کا ترجمہ کر ڈالا۔

گیارہ بج چکے تھے اور ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اُستاد سے اجازت لے اُنہیں آرام کرنے دیا جائے۔ اُٹھنے لگا تو بولے کل دوپہر آجانا مِل کر کھانا بنائیں گے اور مِل کر کھالیں گے۔ میں نے وقت پر پہنچنے کی بھرپور کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ صد حیف میں پھر استاد کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔

موٹر کار ٹکسالی سے اندرون شہر کے علاقہ ہیرا منڈی میں داخل ہوئی یہ بازارِ حُسن پورے متحدہ ہندوستان میں ایک نام اور ایک مقام رکھتا تھا ویسے تو لاہور کے اکثر نوجوان اس بازار سے ایک آدھ بار ضرور گذرتے تھے لیکن زیادہ تر اَن پڑھ زمیندار اُٹھتی جوانی میں کم سن حسیناؤں کی نتھ اُتارنے اور الہڑ رئیس زادے آدابِ محفل سیکھنے آتے تھے اور دونوں ہاتھوں سے دولت

لٹاتے تھے کچھ خوش نصیب کچھ عرصے بعد سنبھل جاتے تھے بہت سے پھسل جاتے تھے برباد ہو جاتے تھے۔

بازار سے گذرتے بھیڑ بڑھ گئی اور ٹریفک جام ہو گیا۔ چند ایک کاروں پر ڈپلومیٹک کور کی نمبر پلیٹ تھی۔ دائیں طرف نظر اٹھی تو ایک الہڑ حسینہ کو ایک لمبی موٹر میں سوار ہوتے پایا۔ بائیں طرف ایک اور حسینہ ایک اور موٹر والے کو اپنے خاص انداز سے دعوتِ عیش دے رہی تھی۔ وہ سب مومن تھیں لیکن کافر ادائی میں کسی سے کم نہ تھیں۔ یہ تو بازار کا حال تھا۔ اندر حویلیوں میں کیا گل کھلتے ہیں یہ اسلامی حکومت کی پولیس ہی بہتر جانتی ہے۔ ہم نوگزے کی قبر سے پانی والے تالاب تک پہنچے۔ وہاں موٹر سے اتر گئے اور عمر سلیم مجھے لے کر گمٹی بازار کی طرف بڑھ گئے پھر جو دائیں طرف بڑھے تو ان کے دو تین دوست واقف مل گئے۔ میرا تعارف کراتے اور انہیں ساتھ لیتے قدم بڑھاتے رہے۔ عمر نے بائیں طرف مڑنے والی ایک گلی میں داخل ہونے کا اشارہ کیا تو میں "کوچہ اورنگ زیب" کا بورڈ دیکھ کر پکار اٹھا یہ تو کوچہ کالی ماتا ہوا کرتا تھا۔ 'ہاں' وہ بولے پہلے یہی نام تھا پھر گھناؤنے ہوئے نام والا پرانا بورڈ بھی نظر آیا اندر داخل ہوئے تو ایک ساتھی پکار اٹھا، آخر ان دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔ کالی ماتا ہو یا اورنگ زیب'! اندر دائیں طرف ایک مکان پر نظر پڑتے ہی گویا زبان سے نکل گیا اس میں تو کالی ماتا کا مندر ہوا کرتا تھا جواب آیا اب رہائش گاہ ہے میں نے یہ جاننے کی ضرورت نہ سمجھی کہ کالی ماتا اور ان کے شیر کہاں غارت ہوئے ہیں؟۔

عمر کے گھر کے ساتھ تھوڑی سی خالی جگہ پر بھینس بندھی ہوئی تھی مجھے قدرے حیرانی ہوئی پوچھ بیٹھا کہ کیا اب بھی اس شہر میں پشو پالنے کی اجازت ہے۔ عمر بول اٹھا عام اجازت تو نہیں ہے لیکن مجھے خاص اجازت مل گئی تھی۔ گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل سوار خاں عہدے سے ریٹائر ہو کر جا رہے تھے تو ایک روز مجھ سے پوچھ بیٹھے کہ عمر میرے لائق کام ہو تو بتا دو۔ میں نے کہہ دیا کہ خدا نے مجھے سب کچھ دیا ہے فقط ایک کمی ہے۔ مجھے گائے بھینس پالنے کا شوق ہے اس کی اجازت مل جائے تو کوئی کمی نہ رہے۔ انہوں نے اپنے خاص اختیار سے مجھے پشو پالنے کی اجازت دے دی بس سارے شہر میں یہی ایک پشو سمجھئے۔

عمر کے گھر میں قدم رکھ نچلی منزل پر واقع ان کے ڈرائینگ روم میں داخل ہوئے۔ تو اسے نہایت آراستہ پایا۔ ایک کونے میں رکھے شیشے کے بکس میں تاج محل کا ایک بڑا نمونہ عین پیمانے کے مطابق پایا۔ بالکل ویسا جیسا مجھے چند ماہ پہلے آگرے میں منعقدہ

جرنلسٹوں کی کانفرنس کا اُدگھاٹن کرتے ہوئے پیش کیا گیا تھا۔ اور جسے میں بھائی عبدالرشید کے لیئے لے جا رہا تھا۔ تاج کا لازوال حسن بیان کرتے ہوئے عمر بولے "اصل تاج کو دیکھنا آسان نہیں۔ ایسے ہی دیکھ کر دل بہلا لیتے ہیں"

عمر تو کھانے کے، پینے کے نہیں۔ انتظام میں لگ گئے اور ہم موسمی حالات پر محوِ گفتگو ہو گئے۔ وہ جو گلی کا موڑ مڑتے ساتھ ہو لیئے تھے اُن میں سے ایک بولے موسم سدا ایک سا نہیں رہتا اور اگرچہ آپ بہت سردی میں آئے ہیں۔ ہم آپ کا خاطر خواہ استقبال نہیں کر سکے۔ لیکن یقین رکھئے کہ اگر کبھی کھلے موسم میں آنا ہوا تو ٹھٹھرن کی جگہ کھلی فضائیں پاؤ گے میں نے پوچھا کہ موسم کب تک کھلنے کی توقع ہے۔ بولے جلد ہی۔ اس پیشینگوئی کی بنیاد کیا ہے، جواب ملا کام ہو رہا ہے"۔ دھیرے دھیرے توازن ماحول بحال ہو رہا ہے۔ مستقل خزاں سے لوگ اُوب چکے اور گرمی کی مار کے بعد جاڑے کے کڑاکے بھی اب زیادہ دیر ستانے والے نہیں ہیں۔"

تو کیا یہ سمجھا جائے کہ گرمی اور سردی کی شدت کے تلخ تجربے کے بعد موسم کو معتدل رکھنے کا انتظام کیا جائے گا اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ پھر وہی گرمی گفتار نہ ہوگی جس نے عقلِ سلیم کو تہ تیغ اور عشقِ عسکریت کو بلند بام کر دیا۔ بولے" اب ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا"

اتنی دیر میں دسترخوان پر کھانا چُنا گیا۔ بہت کچھ تھا۔ کھانا ختم ہوا۔ اور میں نے سگریٹ سلگائی تو عمر بولے۔" کیوں دلی بات کرنا چاہو گے" میں نے حامی بھری تو اُس نے ٹیلیفون ایکسچینج کو دلی کا مطلوبہ نمبر بُک کرنے کو کہا اور ابھی سگریٹ ختم نہ ہوئی تھی کہ میں اپنی بیوی سے بات کر رہا تھا۔ بتا رہا تھا کہ کوچہ کالی ماتا سے بول رہا ہوں۔ کہنے لگیں۔ کوچہ جوہریاں جانا نہ بھولنا (جہاں اُس کا بچپن گذرا تھا) پھر عمر نے فون پکڑ کر" پرچھائی" کہتے ہوئے لاہور آنے کی دعوت دی"

قصّہ جگت مائی کا...

کھانے کے بعد کافی پیتے میں عمر سے پوچھ بیٹھا کہ بھئی اس کمرے کی چھت سیمنٹ اور لنٹر کی ہے یہاں تو سب لکڑی کے شہتیر ہوا کرتے تھے۔ کیا یہ مکان نیا بنا ہے بولا ہاں یہ مکان چند برس پہلے گر گیا تھا۔ اور میں نے یہ قطعہ زمین نیلامی میں خرید کر نئے سرے سے تعمیر کرایا ہے۔ کہنے لگا اس مکان اور اس کی پُرانی مکینہ مرحومہ کا قصہ بھی سُن لو۔ سن سینتالیس میں جب اِن تمام علاقوں کے ہندو اور سکھ جا چکے اور محلّوں کے محلّے اور بازاروں کے بازار شہرِ خموشاں کا منظر پیش کرنے لگے تو ایک بڑھیا نہ جانے کیسے اِس مکان میں رہ گئی۔ بیٹے کا نام کشن لال بتاتی تھی جو سُنار تھا۔ دھیرے دھیرے مشرقی پنجاب سے لُٹے پٹے مسلمانوں کے قافلے آ خالی مکانوں پر قابض ہونے لگے یہ کوچہ نئی صورتوں سے پھر آباد ہوتا گیا۔ مہاجروں نے اِس بڑھیا کو مکان سے نکل کیمپ میں پناہ لینے کو کہا تو وہ بھڑک کر بولی "نہیں جاؤں گی میرا گھر ہے یہیں رہوں گی"۔ شروع شروع میں ہی اس کا کام تمام ہو جاتا تو بات آئی گئی ہو جاتی لیکن چند ہفتے یوں گذر جانے کے بعد اس صبر آزما پیرزن ضعیفہ کے خونِ ناحق کے لئے کوئی خنجر آزما نہ ہوا۔ وہ گھر میں پڑے اناج سے پیٹ کی آگ بجھاتی رہی۔ جب جی کرتا چرخہ تھڑے پر رکھ کاتنے لگتی کبھی موج میں آتی تو اشنان کرنے راوی تک ہو آتی۔ ۱۹۴۷ء کی دیوالی آئی تو صرف اس کے گھر دیئے جلے۔ خود ہی مٹھائی بنائی اور خود ہی محلّے والوں میں

بانٹتی پھری۔ محلّے والوں نے بھی اُس کا حال چال پوچھنا شروع کر دیا۔ پھر یہ ہوا کہ کسی کے گھر کوئی بیمار پڑا تو وہ اُس کا تن تیمار داری کے لئے پہنچ گئی اور پہروں وہیں گذارنے لگی۔ بیمار شفایاب ہوا تو وہ روزانہ آکر بڑھیا کو رام سلام کرنے لگا۔ پھر اور گھروں میں بھی اُس کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ نجانے اس کے قدموں میں کیسی مسیحائی تھی کہ جس گھر میں قدم پڑے دِلی مرادیں پوری ہونے لگیں۔ کسی کے بیٹے کو روزگار مل گیا۔ کسی کی بیٹی کو اچھا وَر نصیب ہو گیا۔ کسی کا عزیز اس کے آشیرواد سے ترقی کر گیا۔ کسی بے اولاد کی گود ہری بھری ہو گئی۔ گویا محلّے والوں سے اس کی اور اس کے ساتھ محلہ والوں کی محبت دن بدن بڑھتی گئی۔ اُس کے گھر میں دانے اگرچہ ختم ہو چکے تھے لیکن محلّہ والوں نے ہر گھر کی باری لگادی کہ اس کے لئے صبح اور شام روٹی، سبزی اور دال پہنچ جائے۔ چائے تو جب جس کے گھر بنتی ایک پتیل کا گلاس بھر کر کوئی بچہ اُس کے لئے بھی لے آتا۔ دھیرے دھیرے اُس بڑھیا کی شہرت علاقہ بھر میں پھیل گئی اور ٹکسالی سے لے کر سید مٹھے تک کے سارے رقبہ میں وہ جگ مائی کہلانے لگی۔ برس برس اسی طرح گذرنے لگے۔ اُس کا بیٹا پھر کبھی نہ آیا لیکن ہر کوئی خود کو اس کا اپنا کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگا۔ آخر ۱۹۶۲ء میں ایک روز یہ بڑھیا سورگ سدھار گئی۔ محلّے والوں نے اکٹھے ہو کر فیصلہ کیا کہ میت کو نہایت احترام کے ساتھ قبرستان لے جا کر دفن کر دیا جائے کہ اس شہر قدیم سے کافروں کے نکل جانے کے بعد قدیم شمشان "رامو کا باغ" بند ہو چکا تھا۔ ڈولا لانے کے لئے ایک محلہ دار مسجد پہنچا تو فرشتہ سیرت مولوی صاحب پوچھ بیٹھے کہ موت کس کے ہاں ہوئی ہے بتانے پر کہ وہ ہندو بڑھیا چل بسی ہے اُسے لے جانا ہے مولوی صاحب خود کوچہ میں آگئے اور سب کو اکٹھا کر کے بولے کہ دیکھو وہ اب مر چکی ہے اُسے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ اس کی لاش کیسے ٹھکانے لگتی ہے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ وہ آخری دم تک ہندو رہی تھی اور ہمارے ایمان کا تقاضہ ہے کہ اس کی آخری رسوم بھی ہندو رواج کے مطابق ادا کی جائیں۔ مولوی صاحب کی بات لوگوں کو سمجھ آگئی۔ ہندو قاعدے کے مطابق اُس کی ارتھی اٹھائی گئی۔ کندھا دینے والے "رام نام ست ہے" پکارتے ہوئے اُسے راوی کے کنارے لے گئے۔ محلہ والوں نے چتا روشن کی اور پھر تیسرے دن اس کی سُر داکھ دریا بُرد کر دی۔ اِس قصہ کے بیان میں آدھی رات گزر گئی

راستے وہی تھے...

۷ اردسمبر ۱۹۸۰ء کو بوقت صبح دھند چھٹتے کوچہ کالی ماتا حال کوچہ اورنگ زیب میں واقع عمر سلیم کے مکان کے کوٹھے پر چڑھا تو سامنے کھلے آسمان تلے بادشاہی مسجد کے چاروں مینار نظر آئے ادھر اُدھر نظر گھومی تو کچھ کبوتر بازی کا شوق بھی پایا۔

رُوم میں رومی بن، صبح کا نہانا بند، فقط منہ ہاتھ دھو، وفا شعار میزبان کی سلیقہ شعار شریکِ حیات رضیہ کے ہاتھوں تیار حلوہ، پوری اور انڈوں کا ناشتہ کیا۔ کچھ اور دیکھنے نکلنے لگا تو عمر نے اپنا ایک بیٹا ساتھ کر دیا۔ کوچے میں قدم رکھا تو کسی گھر سے آواز آئی "وے سکندر" اور پھر اگلے ہی قدم اُس بیٹے نے جو پوچھا کہ انکل لاہور میں کیا فرق دیکھا تو میری زبان سے نکل گیا۔ بیٹے، پہلے اِس لب و لہجہ میں آواز آیا کرتی تھی "وے مہندر" اب وے سکندر کانوں میں پڑ رہا ہے۔ کوچہ کالی ماتا کے سامنے چھپّر والی گلی کو ایک پہلوان سے منسوب پایا۔ بازار سید مٹھا میں اس دکان کے آگے سے گذرا جہاں کبھی میگھی کی دوکان سے گُل بہشت خریدا کرتے تھے۔ رنگ برنگی تاریخ رکھنے والی دھیان سنگھ کی حویلی کی شکستہ حالت دیکھ دُکھی ہوا۔ اس میں کبھی دیال سنگھ ہائی سکول ہوا کرتا تھا۔ اس کے سامنے کشمیر سرکار کی جو جائیداد تھی اُس پر "آزاد کشمیر حکومت کی جائیداد" کا بورڈ لٹکتا نظر آیا۔

تو گرمی کی وہ قدیم قبر جوں کی توں ہے جہاں سے ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو ۳۱۳ خاکسار چپ راس کرتے دوسری جنگ بدر لڑنے نکلے تھے۔ اور ایک انگریز ایس پی بیٹی پر بزن بولنے کے بعد خون میں نہلائے گئے تھے۔ بہت سے جوتے تک چھوڑ پاؤں سر پر رکھ دوڑتے ہانپتے دروغ برگردنِ راوی ہیرا منڈی میں طوائفوں کے کوٹھوں پر پناہ گزین ہوئے تھے۔



غلبہ اسلام قائم کرنے کے مقصد سے قائم خاکسار تحریک کے بانی علامہ عنایت اللہ مشرقی

شاہی محلے کی طرف بڑھتے خوشبویات کے لئے مشہور "بھائیوں کی دوکان"، کے آگے سے گذرا۔ جہاں لٹکتا آہنی گھڑیال ہر گھنٹے بجایا جاتا تھا اور جب ۱۲ بجے کا وقت آتا اور چوکیدار ہتھوڑا اٹھا کسرت شروع کرنے لگتا تو دیال سنگھ سکول کے درجنوں شرارتی طلبا اکٹھے ہو کر "بھائیاں دے بارہ وج گئے۔" پکارنے لگتے تھے۔ پھر روشنائی دروازے کی طرف بڑھتے قلعہ کے زینے کے نیچے واقع اس میدان کو دیکھا جہاں ہر جمعہ یا اتوار کو پتنگ بازی کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ روشنائی دروازے سے حضوری باغ میں داخل ہو بائیں طرف بادشاہی مسجد کی طرف بڑھا۔ مسجد کے زینہ پر بائیں طرف ڈاکٹر اقبال کا منور مزار اور داہنی طرف سر سکندر کی بے چراغ تربت پائی۔ ایک کے عروج کی کہانی، دوسرے کے زوال کی رام کہانی ان قبروں کی زبانِ حال سے سنی۔ جوتے اتار مزار کی دہلیز لانگھ جلتی اگربتی سے معطر ماحول سے گذرا۔ مسحور کن فضا میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ سکتہ میں تھا۔

ع ایسا سکوت جس پہ تقریر بھی فدا ہو

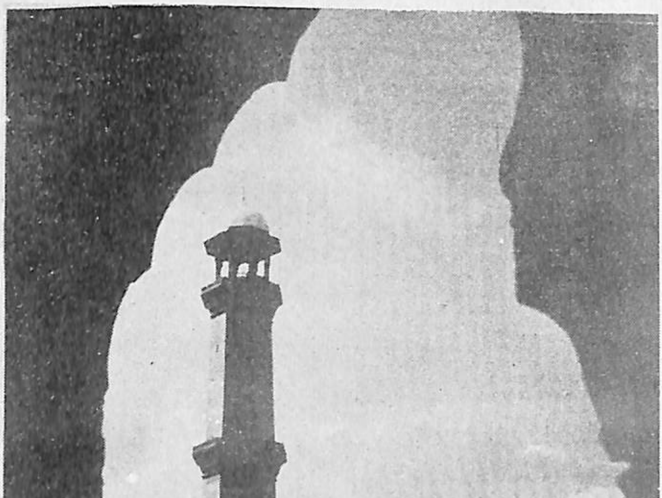
خیالات میں کھو گیا۔ ماضی میں سمو گیا۔ یہ شاعرِ مشرق کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ یہ ہم سب جانتے ہیں۔ لیکن میں ان لمحوں میں کہاں تھا۔ یہ کون جان سکتا ہے؟

ے دلِ دریا سمندروں ڈونگے، کون دلاں دیاں جانے،

کچھ ماضی کی تعبیر، کچھ مستقبل کی تصویر۔ کبھی آبِ رود گنگا وہ دن یاد دلاتا

اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

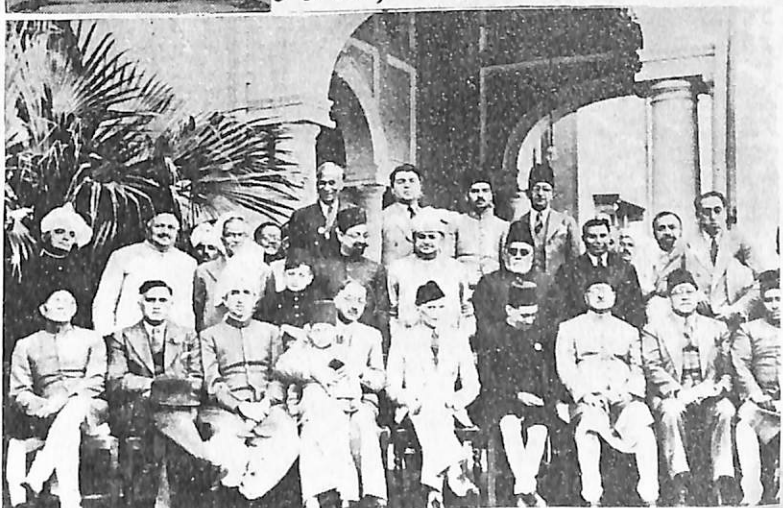
کبھی ع ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔



مزار علامہ اقبال

گنگناتا ستاروں سے آگے والے جہانوں میں جھانکتا، مہر سکوت توڑ، آنکھیں کھول، دیوار پر نظر پڑی تو یہ دیکھ بہت دُکھی ہوا کہ سب شعر فارسی کے ہیں۔ اُردو ایک دم خارج۔ کسی کا حُسن انتخاب، حُسن کرشمہ ساز سے کم نہ تھا۔ اُردو میں ہمالیہ کے سر برف سے دستار فضیلت باندھنے والے شاعر باکمال کے مزار پر فارسی کی دستارِ فضیلت باندھ ہم ایسے فارسی نہ جاننے والوں کے لئے وہ ساری نستعلیق عبارت "کالا اکشر بھینس برابر" بنادی تھی۔ رنجیت سنگھ کی سمادھی کے آگے سے گزرتا ڈیرہ صاحب کے آگے رُک گیا۔ جنگلہ دار دروازہ بند تھا۔ اندر کچھ دُور دو سکھ لڑکے ایک کھاٹ پر بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں دروازہ کھولنے کے لئے پکارا تو جواب آیا "اجازت نہیں ہے"۔ کچھ اور آگے بڑھا تو دُور سے منٹو پارک میں مینار پاکستان نظر آیا۔ یہی وہ جگہ تھی، جہاں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مُسلم لیگ کے اجلاس میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی۔ اُسے دُور سے دیکھنا اور سلام کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اور دائیں طرف قلعہ کی دیوار کے ساتھ ساتھ مستی دروازے کی طرف مُڑ گیا۔ اس دروازے کے باہر کبھی سُتھرے شاہ کا دربار ہوا کرتا تھا۔ گدی نشین کے دیدار اور درشن تو معینہ وقت پر ہوتے تھے۔ البتہ بھنگ چوبیسوں گھنٹے مِلا کرتی تھی مستی





مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس لاہور میں وطن شکن قرارداد پاکستان منظور ہونے کے بعد قائد اعظم اپنے ساتھیوں سمیت

دَروازے میں داخل ہو بائیں طرف ہو لیا۔ چونے منڈی سے گذرتے پُرانی کوتوالی کی قدیم عمارت کو دیکھا جہاں اب سی آئی اے کا دفتر ہے جو بگڑے ہوئے کہیں نہیں مانتے وہ اس کے تہ خانوں

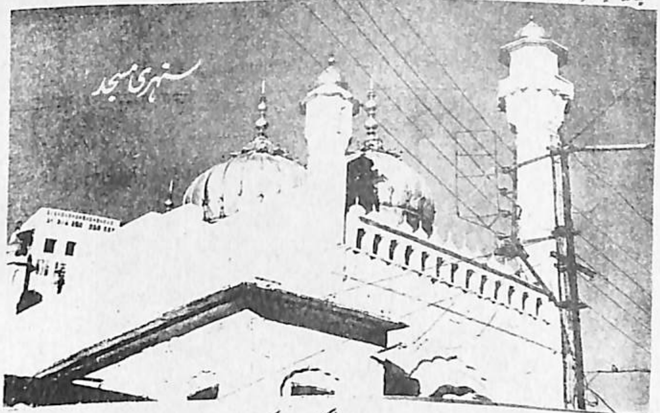


تقسیم ہِند کے فسادات مَیں چونے منڈی کی تباھی کا منظر

میں ڈنڈے پیر کی کرامات سے سب کچھ مان جاتے ہیں۔ اسی راستے کو پکڑے ممتاز کی کٹڑی تک جا پہونچا۔ بابو ممتاز اپنے زمانے میں کوکین کا بادشاہ کہلاتا تھا۔ لاہور سے بمبئی تک اس کی مار تھی۔ بڑے بڑے پولیس افسر اُس کی جیب میں ہوا کرتے تھے، پھر گلی کوچوں سے گذرتا مسجد وزیر خاں کے چوک میں آنکلا۔ کشمیری بازار میں قدم رکھا تو تمام دوکانوں کو بند پایا۔ پھر نوجوانوں کی ایک ٹولی نعرے لگاتی نکلی۔ ایک نئے قانون کے خلاف دوکانداروں نے ہڑتال کر رکھی تھی ،

دکاندار مارشل لاء کے ڈر سے خود آگے آنے سے ڈرتے تھے۔ اسی لئے لڑکوں بالوں کو آگے کردیا تھا۔

کشمیری بازار سے ڈبی بازار میں داخل ہوا، تو وہاں بھی بیشتر دوکانوں کو بند لیکن کچھ ایک کو کھلا پایا۔ پھر ویسے ہی نوجوانوں کی ٹولیاں نعرے لگاتے گذریں۔ سنہری مسجد کی شوکت



بدستور قائم ہے یہی وہ مسجد ہے جہاں پناہ گزیں خاکساروں پر سر سکندر کی پولیس نے شب خون مارا تھا۔ اس کے بالکل ساتھ سنہری گوردوارہ ہوا کرتا تھا جسے ۱۹۴۷ء میں جلاکر راکھ کر ڈالا گیا تھا۔ اسی طرح آگے بڑھتے سرجن سنگھ چوک تک جا پہنچا جہاں ایک تانگے والا دوکانداروں کے لڑکوں کی ایک ٹولی کو دیکھ کر کبھی اُن کا رشتہ اور کبھی حکومت وقت کا رشتہ اپنے گھوڑے سے جوڑ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا "پاکستان کے لئے قربانیاں ہم غریبوں نے دیں۔ مہنگائی کی مار ہم سہہ رہے ہیں۔ لیکن ہمیں لوٹنے والے یہ دوکاندار آج ذرا کرایہ بڑھ جانے پر واویلا کرنے نکلے ہیں۔"میں پانی والے تالاب اور گمٹی بازار سے پھر گذرتا کوچہ کالی ماتا عرف کوچہ اورنگ زیب لوٹ آیا۔

کچھ دیر کے بعد عمر کے ساتھ پھر نکلا تو کوچہ کالی ماتا کے بالکل قریب چھوٹی سی گلی کے مشہور ہنومان مندر میں ایمبرائیڈری کی ایک دوکان دیکھی۔ پھر شیشہ موتی میں ہر چرن کی پوڑیوں کے آگے سے گذرتے وچھووالی میں داخل ہوا۔ اس پرانے موڑ سے عمر ڈاکٹروں کے محلہ والا راستہ پکڑنا چاہتا تھا۔ میں رک گیا اور کوچہ مہتیاں کی طرف ہولیا۔ اسی کوچہ میں داخل ہوا اور وہ

کئی مکان دیکھے جہاں کئی عـــزیز اور یار دوست رہا کرتے تھے ۔ اِس کوچہ سے نکل کوچہ رام دوارے اور کوچہ گیندھراں کی طرف بڑھتے قدم گویا رُک گئے ۔ رام دوارے تک بڑھنے کی خواہش ہی نہ رہی ۔ لگاتار تین برس تک مشہور و دِوان پنڈت لکشمی نارائن جی سے سنسکرت پڑھنے اسی رام دوارے میں جاتا رہا تھا ۔ اِس علاقہ کی ایک ایک اینٹ میری واقف تھی ۔ سب مکان مجھے پہچان رہے تھے لیکن ایک بھی ایسا اِنسان نہ تھا جو مجھے پہچانے ، منزل ہو تو عمر بھر چلتا رہوں ۔ بے منزل چلنا دشوار ہوگیا اور عمر کے ساتھ پھر شاہ عالم مارکیٹ سے گذرتا ایک سکوٹر میں دفتر مشرق پہنچ گیا ۔

دفتر مشرق سے ایک نوجوان کو ساتھ لے مولانا ابو محمد القاسمی سے ملنے مدرسہ اسلامیہ گلبرگ جا پہنچا ۔ زینہ چڑھ چھت پر قدم رکھا تو مولانا کو ایک ستیل پائی پر چند شاگردوں کے ساتھ بیٹھے پایا ۔ دیکھتے ہی پہچان لیا ۔ اور اٹھ بیٹھے اور بولے بس ابھی تمہارا ذکر تھا کہہ رہا تھا کہ سنتوش کی آمد کی خبر اخبار میں پڑھ چکے ہیں ۔ نجانے اب تک ملاقات کا وقت کیوں نہ ملا ۔ میں نے ماجرا سُنایا تو مجھے پکڑ کر وہ کمرہ دکھانے لے گئے جو انہوں نے مجھے ٹھہرانے کے لئے سجا رکھا تھا ۔ دس پندرہ منٹ کے بعد میں نے اُن سے اِجازت چاہی تو اُٹھ کر بغلگیر ہوگئے وفورِ جذبات سے دونوں کی آنکھیں پُرنم تھیں بغلگیر حالت میں یہ کہتے ہوئے کہ اس شہر میں جیب تراشوں سے بچ کر رہنا ، مولانا نے میری جیب میں کچھ ڈال دیا میں نے ہاتھ ڈالا تو سو سو روپے کے تین نوٹ ہاتھ لگے میں نے واپس کرنے پر اصرار کیا تو بولے تم میرے چھوٹے بھائی ہو ، سفر میں ہو ، روپے رکھو کام آسکتے ہیں ،، میں نے بہتیرا اصرار کیا کہ مجھے روپے سے محبت ہے نہ یہاں اس کی ضرورت لیکن وہ نہ مانے ۔ چلنے لگا تو بولے کوئی بھی چیز چاہیئے تو بلا جھجک بتا دو میں نے عرض کی ملک ملک میں گھومتے مسلم دوستوں کے لئے تسبیحیں اکٹھی کرتا ہوں ۔ بغداد ، ماسکو اور بلغراد سے بھی لایا تھا ۔ آپ بھی ایک تسبیح عنایت کیجئے ۔ مولانا نے اپنی جیب سے ایک تسبیح نکالی اور یہ کہتے ہوئے کہ مدینہ منورہ سے لایا تھا میرے حوالہ کردی ۔

مولانا سے اجازت لے اور پھر ملنے کا وعدہ کر میں اسی نوجوان کے ساتھ مال روڈ کے راستہ انارکلی میں داخل ہو ، احسان دانش کا دانش آباد تلاش کرنے لگا ۔ آخر پا لیا ۔ اُن کے بہت پُرانے شاگرد ظفر ادیب کی چٹھیاں حوالہ کیں ۔ پچھلے برس فالج کا حملہ ہوا تھا ۔ ڈاکٹروں نے نجانے کس مرض کا علاج کر ڈالا کہ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ،، والی حالت ہوگئی ۔ آخر ایک ہومیوپیتھ

کا سہارا لیا۔ اس نے مرض کو پکڑ لیا۔ ابھی اگرچہ پوری طرح صحت یاب نہیں ہیں لیکن پہلے سے بہتر ہیں۔ اُن کی بیٹھک میں کچھ اور شاعر بھی موجود تھے۔ کہنے لگے کیسی مشکل بن آئی ہے کہ بھارت اور پاکستان کا بین الاقوامی مشاعرہ نہیں ہو سکتا۔ اِدھر کے لوگ اُدھر والوں کو اور اُدھر والے



دانش بھی خزف گر سے متعلق ہوں بے نیاز
میں خانہ سازی ہوں سے سنت حضرت کی
احسان دانش
22/12/88
۳۷- انارکلی لاہور

اِدھر والوں کو سننے کے لئے ترس گئے ہیں۔ شاعروں اور ادیبوں کے اجتماع ہونے لگیں تو ماحول سنورنے اور توازن بحال ہونے میں کتنی مدد ملے۔ جو کام بڑے بڑے سیاستداں اور سفیر نہیں کر سکتے وہ شاعر اور اَدیب کر سکتے ہیں۔ آخر وہ وقت کب آئے گا جب لاہور اور دہلی میں پھر ویسے مشاعرے ہوا کریں گے جیسے کبھی ہوا کرتے تھے۔ میں نے عرض کی کہ ہماری طرف تو کسی کے بھی آنے پر روک نہیں، جو بھی پاکستانی شاعر دِلّی آنا چاہے اُسے میں ذاتی دعوت نامہ بھیجنے کو تیار ہوں کہنے لگے سوال ایک شاعر کا یا کسی ذات کا نہیں ہے سوال اُلجھے ہوئے مسئلے کو سلجھانے کا ہے۔ بے شک آج بھارت اور پاکستان کے تعلقات چند برس پہلے کے مقابلے میں بہتر ہیں لیکن ضرورت انہیں اور زیادہ سنوارنے کی ہے۔ یہ کھچاؤ آخر کب تک رہے گا وہ دن کب آئے گا جب امریکہ اور کینیڈا کی طرح ان دونوں ملکوں کے لوگ بھی آسانی اور آزادی سے اِدھر اُدھر آجا سکیں گے۔ چائے کے دَور کے ساتھ بات چیت جاری تھی تو ایک اور صاحب بولے "کیا یہ ممکن نہیں کہ دونوں حکومتوں سے کہا جائے کہ ایک مشاعرہ سرحد پر کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ اُدھر سے دِلّی بلکہ لکھنؤ تک کے لوگ اور اِدھر لاہور بلکہ کراچی تک کے لوگ اٹاری اور واہگہ کے درمیان پہنچ جائیں۔ دونوں طرف لاؤڈ سپیکر لگا دیئے جائیں اور ہندوستانی و پاکستانی اِدھر اُدھر بیٹھ کر دونوں ملکوں کے شاعروں کا کلام اُن کی زبان سے سُن لیں"۔

اسی نیک لیکن اَرباب اقتدار کے لئے چبھتی تجویز سے بھلا کون نیک نیت انسان اتفاق نہ کرے گا۔ میں نے دانش صاحب سے پوچھا کہ پاکستانی اَدیب اور شاعر آج کہاں ہیں۔ بولے کچھ کھڑے ہیں لیکن کچھ لیٹ گئے ہیں پھر ایک نامور اَدیب کا نام لے کر بولے کل تک ترقی پسند

بنتے تھے۔ اب آرام پسند ہیں چولا بدلنے کا صلہ یہ ملا ہے کہ حکومت نے ایک لاکھ کے انعام سے نوازا ہے۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ اُستاد پر زیادہ بوجھ پڑے۔ اجازت چاہی تو اپنے تازہ مجموعہ کلام "فصلِ سلاسل" کا نسخہ دستخط کر کے میرے حوالے کیا۔ "اپنی صداقت پسندی اور حقیقت نگاری کے جرم میں زندگی بھر مشکلات سے دوچار اور پریشانیوں سے دوبدو" رہنے والے اس شاعر نے یہ کتاب جناب محترم جنرل ضیاء الحق صاحب صدر پاکستان کے نام نامی سے معنون کی ہے۔ نجانے کیوں؟ مہاتما گاندھی کے حادثۂ موت کی خبر سُن کر "بُت کدہ سے حرم تک" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

غضب ہے رخصتِ ساقی سے میخانے پہ کیا گذری
صراحی کا ہوا کیا حال، پیمانے پہ کیا گذری
یہ پوچھے کوئی اس گرد و غبارِ بے تحاشا سے
کہ دیوانے کے گم ہونے سے ویرانے پہ کیا گذری
مبارک زندگی ہی کو مبارک موت ملتی ہے
عدو بھی کہہ رہے ہیں ہائے بیگانے پہ کیا گذری

پھر "آہ ابوالکلام" کے عنوان سے لکھا ہے ؎

یہ ایسی شمع بجھی ہے ارے معاذ اللہ
نظر میں صرف اندھیرا ہے۔ رہگذار نہیں

کچھ اور سُنیئے۔ "جو وقت نزدیک آرہا ہے" کے عنوان سے لکھتے ہیں ؎

صحافیوں کے دل و نظر کو نحیف و نادار دیکھتا ہوں
زبان و افکار بک رہے ہیں قلم کے بیوپار دیکھتا ہوں
عوام دن رات مر رہے ہیں خواص پر کچھ اثر نہیں ہے
جو وقت نزدیک آرہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے
نہ جانے کس دن عوام بگڑیں خواص ظلم و ستم بڑھادیں
نہ جانے کس دن یہ جھونپڑیوں کے مکیں محلوں کو لڑکھڑادیں
نہ جانے کس دن غریب گاہک دکانداروں کا زعم ڈھادیں

نہ جانے کس دن خموش فوجیں نظامِ نو کا علم اٹھا دیں!
نظامِ نو کا جو سیل رو کے مجال دیوار و در نہیں ہے
جو وقت نزدیک آ رہا ہے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

دانش صاحب سے اجازت لے اُسی بازار انارکلی کے "بانو بازار" میں پہنچا۔ اپنے سٹاف کے زاہد کی چھٹی اس کے بھائی کو پہنچانی تھی۔ بانو بازار کو مینا بازار کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ہر دکان پر لڑکیوں اور عورتوں کے ٹھٹھ تھے ہر ایک پلی ہوئی تھی۔ شاید ہی کسی نے پاؤڈر یا سُرخی لگا رکھی ہو۔ قدرتی حسن نے کسی بناؤ سنگھار کی گنجائش ہی نہ رکھی تھی ؎

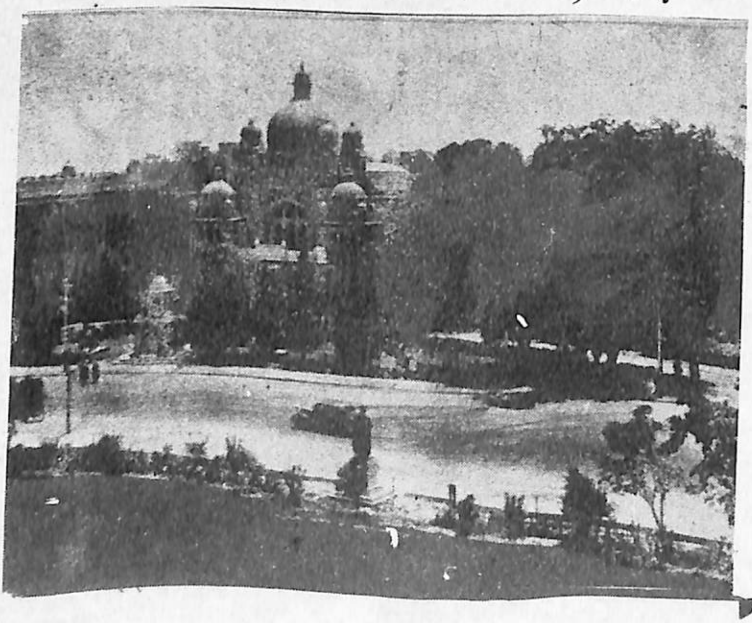
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

کسی بھی ملک کی عورتوں کی صحت پوری قوم کی صحت کی علامت ہے۔ یہاں ہر لڑکی اور عورت کو صحت مند پا کر بہت خوش ہوا۔ کاش چاندنی چوک یا امین آباد یا چورنگی یا بوری بندر یا تھر گڑی میں ایسی صحت مند لڑکیاں اتنی بھاری تعداد میں نظر آئیں۔

اَب کچھ اور دیکھنے نکلا۔ انارکلی سے نکل سرکلر روڈ پر بھاٹی دروازے کا رخ کیا اور پھر بریڈلا ہال جانے کے لئے کربلا گامے شاہ کی طرف ہو لیا اس کربلا میں قدم رکھنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ چند برس پہلے آبِ فرات سے ہاتھ منہ دھو کر کربلا معلّےٰ کی زیارت کر چکا تھا اور وہاں سے سجدہ گاہ لا اپنے شیعہ دوستوں میں بانٹ چکا تھا۔ بریڈلا ہال اب خستہ حال ہے کوئی ٹیکنیکل ادارہ چل رہا ہے۔ کوئی اسی برس پہلے پنجاب کانگرس نے اس عمارت کو تعمیر کرایا تھا۔ سریندر ناتھ بینرجی نے اس کا سنگ بنیاد رکھا تھا اور اُسے جنگِ آزادی کے ایک حامی انگریز بریڈلا سے منسوب کر دیا تھا۔ تقسیم ملک تک پنجاب صوبہ کانگرس کمیٹی کا صدر دفتر اسی عمارت میں ہوتا تھا نہرو اور سبھاش اور جے پرکاش سب کبھی نہ کبھی اسی ہال میں منعقدہ جلسوں میں بولے تھے۔ قیامِ پاکستان کے وقت امرتسر کا ایک کانگرسی مسلم کنبہ لاہور پہنچ کر اس عمارت میں ٹھہرا تھا۔ اسی کنبہ کے ایک فرد سے ملنے گیا تھا کہ وہ کچھ عرصہ پہلے دو دوستوں کے ساتھ دلّی آیا تھا تو اتفاق سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس روز اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ بتا آیا کہ اگر کسی نے مجھے ملنا ہو تو مشرق کے دفتر پہنچ جائے۔ وہاں سے نکل نیلے گنبد اور گورنمنٹ کالج کے درمیان لوئر مال سے گذرتا اور گول باغ پار کرتا عجائب گھر کے باہر بھنگیوں کی توپ تک آ پہنچا۔ بائیں طرف یونیورسٹی کے باہر ماہر علم الہند وولنسر کا مجسمہ بدستور

کھڑا ہے۔ بس لاہور میں اب یہی ایک مجسمہ ہے۔ بُت شکنوں کی دست بُرد سے بچ نکلا ہے شاید اس لئے کہ اہلِ کتاب کا ہے۔ اس شام مشرق کے ساتھیوں نے خاص ڈنر کا انتظام کیا لکشمی انشورنس کمپنی والے چوک کے بالمقابل رائل پارک میں اسی پُرانے ریسٹوران میں جہاں میں نے زندگی میں پہلی بار بیئر پی تھی۔ اس زمانے میں ۹ آنے کی بوتل ملتی تھی۔ کھانے کی میز پر پُرانی تلخیاں بھلا کر دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات مزید استوار نے کی ضرورت پر زور دیا گیا اور ہم سب نے باہمی تعلقات کو مضبوط کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے کا حلف لیا۔

لاہور میں تیسری رات اسی جرنلسٹ کالونی میں سرفراز کے ہاں گذری۔



یہیں داہنے طرف سے شروع ہوتے والی مال روڈ حال شاہراہ قائد اعظم کے پار عجائب گھر کی عمارت دیکھئے اور ادھر ایک اونچے آسن پر ڈاکٹر وولنر کا مجسمہ۔

درشن گیتا بھون کے

۱۸ردسمبر ۱۹۸۰ء لاہور میں میرا چوتھا دن تھا۔ اسی شام کراچی روانہ ہونا تھا۔ صبح سرفراز کے ساتھ ناشتہ کر گھر والوں سے اجازت لی اور بوریئے بستر سمیت دفتر مشرق آن پہنچا۔ سامان ایڈیٹوریل رُوم میں ٹکا کچھ اور دیکھنے اور ملنے ملانے نکلنے لگا تو ایک سینئر جرنلسٹ نے خبر کی کہ روزنامہ کے چیف ایگزیکٹیو شری اقبال زبیری نے یاد فرمایا ہے۔ میں اگرچہ اُن کے حُسن سلوک کی تعریف سُن چکا تھا لیکن ملنے کا اتفاق ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ کمرے میں داخل ہو آداب بجالایا۔ انہوں نے اُٹھ کر مصافحہ کیا اور پیار سے "تشریف رکھئے" کہتے ہوئے بولے "میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے" ان کے کشادہ دستِ کرم ساتھیوں نے کچھ بھی کہنے کو نہ چھوڑا تھا۔ اُنہوں نے جس پیار سے مجھے سنبھالا تھا اس کے لئے دل کھول کر 'شکرا' کہہ کر خاموش ہوگیا۔ اس بلند اقبال کرسی نشین کے سامنے بصورت حقیر فقیر بالتقصیر خاک نشیں ہوگیا۔ بتانے لگے کہ 'مشرق' کا جنم کن حالات میں ہوا اور اب لاہور، کراچی، پشاور اور کوئٹہ سے چھپنے والا یہ کثیرالاشاعت روزنامہ ملک میں کیا مُقام رکھتا ہے کہنے لگے کہ اس ادارے کے بانی شری عنایت اللہ مرحوم روزِ اوّل ہی بھانپ گئے تھے کہ کیا زمانہ آنے والا ہے انہوں نے سیمابی سیاست کا قصّہ و قضیہ چھوڑ ہر دوسر ذوق کا سامان مہیا کرنے کی کوشش کی۔ ساتوں دن مصوّر ایڈیشن نکلتے ہیں کیا بوڑھے کیا جوان، کیا پردہ نشین خواتین خانہ اور کیا بے باک بٹیاں سب ہی کی حاجت روا کرنے کی سعی ہمارا منشاء و مقصد ہے کچھ وقت یوں گذرنے کے بعد میں نے اجازت چاہی تو میز

پر بڑی ایک جے پوری ایش ٹرے کی طرف اشارہ کرکے بولے کہ انہی میں سے یہ ایک ہے جو آپ نے کل ساتھیوں کو پیش کی تھیں اور پھر انہوں نے میز کی دراز کھول ایک مرمریں قلمدان نکال محبت کی علامت کے طور پر مجھے پیش کر دیا۔ میں نے ایک بار پھر شکریہ ادا کیا اور اجازت لی۔

مجھے ابھی کچھ اور چٹھیاں بانٹنا تھیں ایک شری مظہر علی کے نام تھی۔ اُن کے بڑے بھائی شری محمود علی مرحوم تقسیم ملک سے پہلے کے وقتوں میں مجھ پر بڑے مہربان تھے دونوں بھائی آکسفورڈ میں تحصیل علم کے زمانہ میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے تھے۔ میاں افتخار الدین مرحوم اور سید سجاد ظہیر مرحوم کے ساتھیوں میں تھے دسمبر ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد جب بھارت اور پاکستان کے تعلقات سب سے نچلی سطح پر آگئے تھے اور ہر قسم کا تعلق ٹوٹ چکا تھا اور آمدورفت بالکل بند ہو چکی تھی تو دسمبر ۱۹۷۲ء میں سب سے پہلے بھارت آنے والے پاکستانی جرنلسٹ یہی مظہر علی تھے وہ اس وقت ڈان کے ایڈیٹر تھے اپنے ایک ساتھی نجی اللہ کے ساتھ پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی سے ملنے دلی آئے تھے تو ہم نے دلی یونین آف جرنلسٹس کی طرف سے اُن کو ایک استقبالیہ دیا تھا معلوم ہوا کہ وہ لارنس روڈ پر واقع فلاں عمارت میں ملتے ہیں۔ میں نے ہال روڈ سے اس عمارت تک پہنچنے کے لئے مال روڈ پار کی تو ایک طرف مسجد شہدا نظر آئی۔ شہید کہیں کے ہوں قابل تعظیم ہیں۔ جھک کر سلام کیا لیکن یہ یادگار من کو نہ بھائی۔ قابل دید مسجد شہداء وہ ہے جو بغداد ہوائی اڈے سے شہر کو آتے راستہ میں دیکھی تھی۔ کیا اُٹھان ہے اور کیا بلندی ہے۔ لارنس روڈ میں مظہر علی کے دفتر پہنچا تو انہیں نہ پایا معلوم ہوا کہ صحت ٹھیک نہیں ہے کبھی آتے ہیں اور کبھی نہیں آتے۔ میں نے چٹھی وہاں موجود ایک شخص کے حوالے کر دی اور باہر نکل آیا۔ ملاقات نہ ہو سکنے کا افسوس رہا۔ ایک اور چٹھی نوائے وقت کے ایڈیٹر عارف نظامی کے نام تھی۔ فون کیا تو اُنہیں بھی نہ پایا۔ وہ چٹھی بھی اُنہیں پہنچانے کے لئے "مشرق" کے ایک جرنلسٹ کے حوالے کر دی۔

لاہور میں میری موجودگی کی خبر بہتوں کو ہو چکی تھی۔ لیکن نہیں جانتا تھا کہ کچھ لوگ میری تلاش میں یوں پھر رہے ہوں گے۔ میں نسبت روڈ پر گیتا بھون کے آگے سے گذرتے اسی عمارت کے سیمنٹ کے پلاستر پر چونے سے لکھا گیتا کا یہ فرمان

यदा यदा हि धर्मस्य ग्लानिर्भवति भारत । अभ्युत्थानमधर्मस्य तदात्मानं सृजाम्यहम्॥
परित्राणाय साधूनां विनाशाय च दुष्कृताम् । धर्मसंस्थापनार्थाय संभवामि युगे युगे ॥

تنزل پہ جب وقت آتا ہے دھــرم
اُدھــرم آکے کرتا ہے بازار گرم
یہ اندھیــرجب دیکھ پاتا ہوں میں
جنم لے کے دُنیا میں آتا ہوں میں (ترجمہ خواجہ دل محمد)

پڑھ رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مُڑکر دیکھا تو چار پانچ لوگ تھے۔ پوچھا کہ بھئی آپ کون ہیں تو وہی شانے پر ہاتھ رکھنے والا بولا ہم 'مساوات' کے جرنلسٹ اور نان جرنلسٹ ہیں۔ ہمیں آپ کے آنے کی خبر تھی۔ تلاش میں تھے۔ دفتر 'مشرق' جا رہے تھے کہ یہیں پالیا۔

پوچھا "پہچانا کیسے؟" بولا سُن چکا تھا کہ آپ نے اوورکوٹ پہن رکھا ہے۔ فر کی ٹوپی سر پر اور ڈنڈا بغل میں دبائے لاہور میں گھوم رہے ہیں۔ ایسی صورت کو اچانک گیتا بھون کی طرف دیکھتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ آپ ہی ہوں گے۔

ع تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔

بولے "ہماری طرح سخانے کتنے دھکے کھا رہے ہیں۔ دَر دَر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ نہ جانے کن کرموں کا پھل پا رہے ہیں۔ کوئی پُرسان حال نہیں۔ شروع شروع میں ہماری یونین نے بلکہ اخباری ملازموں کی تمام یونینوں نے مِل کر بہت کوشش کی کہ اخبار پھر کُھل جائے لیکن صیاد خانے میں صید کی آواز کون سُنتا ہے۔"

ہم چلتے جا رہے تھے اور وہ اپنی رام کہانی سُناتے جا رہے تھے میں نے اُنہیں یہ سمجھانے کی ہر چند کوشش کی کہ مجھے یہ سب کچھ سُنانے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں یہیں کچھ کیجئے بلکہ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ سب کیجئے۔

کہنے لگے ہم بھی جانتے ہیں کہ آپ ہمارے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ سُکھ بانٹنے سے بڑھتا اور دُکھ بانٹنے سے گھٹتا ہے۔ ہم نے سُنا ہے کہ آپ ہندوستان کی نیوز پیپر انڈسٹری کے ایک ٹریڈ یونین ورکر ہیں آپ کو ہمارا دُکھ گھٹانے میں تو ہاتھ بٹانا چاہئے مساوات کے جرنلسٹوں اور نان جرنلسٹوں پر کیا گذری۔ یہ میں پہلے بھی تفصیل سے سُن چکا تھا۔ ذاتی تجربے سے بھی جانتا تھا کہ جب ہڑتالیں اور تالہ بندیاں لمبی ہو جاتی ہیں تو ساتھیوں پر کیا گذرتی ہے اپنے تک بیگانے ہو جاتے ہیں۔ روز کے ملنے والے آنکھیں چرانے لگتے ہیں

بیویوں کے زیور تک بک جاتے ہیں۔ بچّوں کی تعلیم ہی نہیں اُن کا دُودھ تک رُک جاتا ہے۔ محلہ کا بنیا اُدھار دینا بند کر دیتا ہے اور ذہنی توازن تک جاتا رہتا ہے۔ وہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا اور اتنا لمبا ہو چکا تھا کہ حکومت بدلے بغیر پرس کا تالہ کُھلے تو کیسے ؟

وہ سناتے رہے اور میں سُنتا رہا اور دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ وہ زمانہ کب آئے گا جب اس ملک میں سلطانیٔ مطلق کی جگہ سلطانیٔ جمہور قائم ہوگی۔ نقشِ کہن مٹ جائے گا اور بندوق کی سنگین ایسی شاخِ نازک سے جس ریاست بے سیاست کا ناپائیدار آشیانہ لٹک رہا ہے اس کی جگہ جانے پہچانے چار مضبوط ستونوں پر کھڑے سنگین حصار ایک جمہوری ریاست کا احاطہ اور اُس کی حفاظت کریں گے۔

مساوات کے ساتھیوں کے دردناک حالات سُن مجھے رونا آگیا۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

میری یہ حالت دیکھ وہ بھی رونے لگے اور رام کہانی سُنانا بند کر دی۔ میں اِن دکھیوں کو بھلا کیا یقین دلا سکتا تھا۔ اُمید ہی ظاہر کر سکتا تھا کہ اگر اُن کے ارباب بست و کشاد قدیم و جدید ریاستوں کے عروج اور اُس سے زیادہ اُن کے زوال کے اسباب احاطۂ نظر میں رکھتے ہیں تو جلد از جلد عقل کے ناخن لیں گے اور بیروزگاروں کی بگڑی کو بنانے میں ہاتھ بٹائیں گے۔

اگر اس شہر لاہور میں شیرِ پنجاب پر برسنے والی ہر لاٹھی سامراج کے تابوت میں ایک میخ بنی تھی تو یقیناً اُس شہر میں مساوات کے مزدور کے پیٹ پر پڑنے والی ہر لات موجودہ نراج کے تابوت کے لیئے بھی ایک میخ بن سکتی ہے

پُرنم آنکھوں سے ہم ایک دوسرے سے الگ ہوئے، اور ہاتھ لہراتے ہوئے دُور تک خدا حافظ کہتے گئے۔ پھر میں شاہ عالم مارکیٹ سے سرکلر روڈ پر موچی دروازے کی طرف بڑھا داہنی طرف اس مسجد کو دیکھا جو حرارتِ ایمانی رکھنے والوں نے راتوں رات کھڑی کر دی تھی اور جس کا سنکر اقبال یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

مسجد تو بنا لی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
مَن اپنا پُرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اکبری، موچی اور دہلی دروازے تک بڑھا اسی دہلی دروازے کے بیرونی باغ میں کیسے کیسے عظیم الشان جلسے ہوا کرتے تھے۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری ہوں یا مظہر علی اظہر عشاء کی نماز کے بعد بولنے لگتے تھے تو فجر کی نماز کے وقت رُکنے کا نام لیتے تھے اُن کی آتش بیانی اور شعلہ نوائی پر سامعین کی زبان سے کبھی آہ اور کبھی واہ نکلتی تھی۔ کلہاڑی بردار احرار جلسہ کی حفاظت پر مامور ہوتے تھے۔ سامنے ایک بیٹھک میں مجلسِ احرار کا دفتر ہوتا تھا اس کے ساتھ ہی ایک 'انجمن اصلاحِ چارسو بیساں' کا دفتر بھی تھا۔ باغ وہی تھا لیکن اب ماحول مختلف تھا۔ لوٹ آیا۔

وقت مانندِ پرند محوِ پرواز تھا اور ابھی کیئوں سے ملنا باقی تھا۔ ایک بار پھر مال روڈ کے اُس ریستوران میں پہنچا جہاں دو روز پہلے پھر ملنے کا وعدہ کر آیا تھا۔ اس بار تو اُس نیک خو انسان نے حد کر دی۔ چائے تو بھلا میں نے پینی ہی تھی اُس نے پانچ سو روپے بھی یہ کہہ کر زبردستی جیب میں ڈال دیئے کہ سفر میں جتنا پیسہ پاس ہو کم جانو۔ وہیں کچھ اور بھی ملے۔ کچھ مہاشہ کرشن کے بے باک قلم کے مداح، کچھ شری نریندر کے پرانے واقف کار، کچھ نیپالی صاحب کے پرانے جاننے والے۔ مال روڈ کی دوکانوں کے آگے سے گزرتے وہی ماحول پایا جو کناٹ پلیس میں نظر آتا ہے۔ پیچھے سے کیا سامنے تک سے پہچاننا مشکل کہ لڑکا ہے یا لڑکی میرے لئے یہ ماننا مشکل ہو رہا تھا کہ میں ایک اسلامی ریاست میں ہوں۔

پانچ بج رہے تھے اور موسم بھی بگڑ رہا تھا میں دفتر 'مشرق' لوٹ آیا۔ رپورٹروں کے کمرے میں بیٹھا تو ایک رپورٹر پوچھ بیٹھا کیوں کسی سیاسی لیڈر سے بھی ملاقات ہوئی۔ میرا جواب نفی میں پا کر بولا۔ ہائی کورٹ چلو وہاں ہر مدرسۂ فکر کے وکیل ملیں گے۔ میں نے یہ کہہ بات ختم کر دی کہ اوّل تو میں آج شام ہی کراچی روانہ ہو رہا ہوں اور دوم میں یہاں کسی سیاسی لیڈر سے ملنے نہیں آیا۔ اتنی دیر میں وہی خطاطِ اعلیٰ محمد عبّاس صاحب اور شاہ خطاط گلزار شریف صاحب آن پہنچے۔ میں نے عرض کی کہ ابھی کچھ وقت ہے چلئے تاج کے بیٹے سے مل آئیں عبّاس صاحب فوراً مان گئے اور اُن کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہو احاطہ دفتر سے باہر نکلا تو دلی میں ایک بار ملنے والا بٹ سامنے سے آتا نظر آیا جسے ملنے برینڈلا ہال گیا تھا اس کے ساتھ جو دو دوست دلی آئے تھے اُن میں یہ بٹ بھی شامل تھا۔ مجھے لاہور آنے کی دعوت دے گیا تھا۔ آج مجھے آن ملا تھا۔ میں نے اُسے وہیں ٹھہرنے کا مشورہ دیا اور عبّاس کے ساتھ ہو لیا۔

اس وقت سڑکوں پر بھیڑ بڑھ چکی تھی اور ہم بہ مشکل انارکلی سے گذرتے لوہاری دروازے کے اندر اُسی بیٹھک کا تیاں میں پہنچے جسے میں نے پہلے ہی روز دیکھا تھا۔ تاج کا مرقع نذرِ میر پاسس تھا۔ سلیم بن تاج نے جب اپنے باپ کے ہاتھ کا لکھا "بپاسِ خاطرِ سنتوش کمار" دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ بیدرد زمانہ کی ترکتازیوں کا رونا رونے لگے بولے "اب یہ مرقع یہاں بھی نایاب سمجھو"۔ میں نے کہا کہ اگر ہم بغرض اشاعتِ فن دلی میں آفسیٹ پر چھپوالیں تو کوئی اعتراض تو نہیں بولے "اعتراض کیا - ہم یاد رکھیں گے کہ ہمارے والد کے قدردان اُدھر بھی ہیں"۔ چائے کی پیالی پر دس پندرہ منٹ بات چیت جاری رہی۔ میں نے سلیم کو دلی آنے کی دعوت دی اُس نے کبھی آنے کا وعدہ کیا اور اپنی خطاطی کے کچھ نمونے پیش کئے جنہیں میں نے تبرک سمجھ کر قبول کیا۔

ہم دفتر مشرق لوٹ رہے تھے تو عباس صاحب نے سفر کے لئے ناشتہ کا انتظام کرنے کا سوچا۔ گوالمنڈی میں مچھلی کی ایک دوکان سے آدھا کلو مچھلی اور تین عدد نان بندھوا لئے۔ دفتر پہنچے تو بٹ موجود تھا۔ میں نے وہاں موجود ساتھیوں سے اجازت لی تو کچھ ایک نے ایک گروپ فوٹو کھنچوانے پر اصرار کیا اور ساتھ ہی گلزار شریف نے یہ خوشخبری سُنائی کہ کراچی سے عبدالرشید کا فون آیا ہے وہ کل کراچی سٹیشن پر آپ سے ملیں گے۔ میں اور بٹ تو ایک سکوٹر رکشا میں سامان سمیت سوار ہوئے اور موٹر سائیکل سوار عباس صاحب ہمارے ساتھ ہو لئے اندھیرے میں لاہور سٹیشن کی بلندی پر لال چمکنے والا کلمہ پڑھا۔ سن سینتالیس کے بعد پہلی بار اس سٹیشن پر قدم رکھ رہا تھا۔ آخری بار شاید آخر جولائی یا شروع اگست ۱۹۴۷ء میں گیا تھا۔ جب گاندھی جی کشمیر سے لوٹتے دلی جا رہے تھے۔ مدھم روشنی میں مطلوبہ پلیٹ فارم پر پہنچے "تیز رو" نے سوا سات بجے چھوٹنا تھا۔ لیکن ہمارا برصغیر اور پابندی اوقات۔ ابھی تو ناممکن سمجھو۔ اِدھر تو ایمرجنسی میں معاملہ کچھ سدھر گیا تھا اُدھر مارشل لا میں بھی ریلوے نظام کو بدنظمی کی تصویر پایا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟ گاڑی چلنے کا وقت نکل گیا لیکن گاڑی نہ آئی۔ سواریوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ اور سب پریشان و حیران نظر آرہے تھے۔ آخر کسی نے خوشخبری سُنائی کہ وہ دیکھو اس سامنے والے پلیٹ فارم پر گاڑی لگ رہی ہے۔ بھگدڑ مچی، بٹ نے سوٹ کیس اُٹھایا عباس صاحب نے ڈبہ تلاش کیا اور اِس دھکم پیل میں شامل میں بھی کسی طرح سے ڈبے میں سوار ہو لیا۔ کہنے کو یہ ریزرویشن والا ڈبہ تھا لیکن وہاں پوچھنے والا کون تھا۔ وہی حال تھا جو اِس ملک کی تیز رفتار

گاڑیوں کے ریزرو ڈبوں میں کبھی کبھار ہو جاتا ہے۔ گاڑی سرکی۔ آدھا پون گھنٹہ لیٹ ۔ میں نے دونوں سے اجازت لی۔ انہوں نے خدا حافظ کہہ مجھے سیٹ سنبھالنے کا مشورہ دیا۔

میرے ساتھ جو بزرگ بیٹھے تھے وہ چند منٹ میں ہی کھل گئے۔ اصل لاہوری تھے۔ اور جب انہیں معلوم ہوا کہ میں بھی جنم کا لاہوری ہوں اور ۳۴ برس بعد اپنا شہر دیکھنے آیا ہوں تو پھر تو ہم گویا بات کی بات میں گھی شکر ہو گئے۔ ایک ہی زبان ایک ہی لب و لہجہ۔ زندہ دلان لاہور کی شاندار روایات۔

وہ دن یا ہم پیار کے چرچے تھے دستور محبت قائم تھا
جب یہ زبان جھگڑا ہندی اُردو ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے'
کا دور ابھی نہ آیا تھا۔

کہنے لگے پہلے موچی دروازے میں دوکان تھی۔ اب شاہ عالم مارکیٹ میں ہے۔ کاروبار بیٹوں کے سپرد ہے۔ خود مال لینے کبھی کبھار کراچی چلے جاتے ہیں، کہنے لگے "تم یقین نہیں کرو گے کہ ہندوؤں سے میری صحبت کا یہ عالم تھا کہ میں گوشت تک نہیں کھاتا تھا اب بھی جہاں تک ہو سکے نہیں کھاتا۔ ہاں عید قرباں کو مذہبی فریضہ سمجھ کر قربانی ضرور دیتا ہوں پھر "مستانہ جوگی" اور اس کے لائق فائق نامی گرامی ایڈیٹر صوفی لچھمن پرشاد کا ذکر چھیڑ بیٹھے جب میں نے بتایا کہ صوفی صاحب چل بسے ہیں تو بہت رنجیدہ ہوئے۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کہنے لگے جی چاہتا ہے کہ پھر وہ رسالہ پڑھوں۔ مضامین کتنے دلچسپ ہوتے تھے۔ پوچھ بیٹھے کہ کیا اب بھی چھپتا ہے اور جواب اثبات میں پانے پر کہنے لگے کہ کیا کچھ پرچے بھجوانا ممکن ہوگا۔

میں نے دلی لوٹ صوفی صاحب مرحوم کے بیٹے شری بھٹناگر سے رابطہ قائم کیا اور ماجرا سنایا۔ انہوں نے خاص طور پر دفتر پرتاپ میں آکر پچھلے کچھ پرچے اور اس بزرگ کے نام رقعہ لکھا جو لاہور بھیج دیا گیا۔

رات آرام سے گذری۔ میں نے اوورکوٹ تو پہن ہی رکھا تھا۔ دلی سے چلتے وقت ایک بھاری کمبل اور ایک تکیہ بھی سوٹ کیس میں ڈال لیا تھا کہ بوقت ضرورت کام آویں۔ حسب معمول ہر قسم کے تفکرات سے آزاد ۔ گہری نیند سویا ۔ صبح آنکھ کھلی تو کچھ وقت کٹنے پر پنجاب اور سندھ کا سرحدی سٹیشن رحیم یار خان آیا۔ کھلتے موسم میں ہم نواب شاہ پہنچے شاید ریلوے ورکرز یونین کے چناؤ کا زمانہ تھا۔ سٹیشن کی ہر دیوار بلکہ وہاں کھڑی ہر گاڑی پر ابراہیم

زندہ باد لکھا پایا۔ گاڑی نواب شاہ سے چلی تو میں اِدھر اُدھر بیٹھوں سے پوچھ بیٹھا کہ کیوں بھئی اَب تو کوئی نواب نہیں رہا۔ سامنے بیٹھے ایک نے کہا کہ ریاستیں پاکستان میں مدغم ہو چکی ہیں اَب کوئی پُرانا نواب نہیں رہا لیکن دُور بیٹھے ایک نوجوان نے گرہ لگائی "لیکن وہ جو ایک ہی بڑا نواب کلہاڑا سنبھالے آ بیٹھا ہے"۔ سب مطلب بھانپ گئے اور ڈبہ قہقہہ زار بن کر رہ گیا۔ کچھ اور وقت کٹا۔ میرے سامنے ایک جوڑا بیٹھا تھا۔ میاں ٹنڈو آدم کا اور بیوی گوجرانوالہ کی تھی۔ بیوی نے میرے سوٹ کیس سے لٹکتے میرا وزیٹنگ کارڈ بحروف اُردو پڑھ کر میاں کے کان میں کچھ کھُسپسایا۔ اس سندھی کی آنکھیں چمک اُٹھیں کہنے لگا بھارتی سکے ہوں تو دکھاؤ۔ میں نے پچاس پیسے کا وہ سکہ دکھایا جو جمہوریہ کی سلور جوبلی پر جاری ہوا تھا اور عام چلتا ہے۔ سکہ کے ایک طرف پارلیمنٹ کی تصویر اور اس کے ساتھ ایک مرد اور ایک عورت ترنگا پکڑے دیکھ بہت خوش ہوا۔ بیوی بولی کہ کوئی بھارتی نوٹ دکھاؤ۔ میں نے دس روپے کا ایک نیا سا نوٹ نکال اُس سندھی کا نام پیار سے لکھ کر اُس بیٹی کے حوالے کر دیا۔ اُس نے غور سے دیکھا اور بولی کہ اتنی زبانوں میں کیا لکھا ہے؟ بتانے پر کہ ہمارے نوٹ کی قیمت ان تمام زبانوں میں لکھی ہے جو از روئے آئین ملک کی سرکاری زبانیں ہیں۔ بہت حیران ہوئی۔ وہ نوٹ اُس نے اپنے بٹوے میں سنبھال لیا۔ بڑا پیارا جوڑا تھا۔ پنجاب اور سندھ کو ملانے



تقسیم کے وقت لاہور کی تباہی کا ایک اور منظر

والا تھا۔ قومی یک جہتی کی علامت تھا دونوں آپس میں کبھی سندھی اور کبھی پنجابی بولتے تھے لیکن میرے ساتھ فقط پنجابی بولتے رہے۔

گاڑی کچھ لیٹ چل رہی تھی۔ رات بھر چونکہ کچھ کھایا نہ تھا لہٰذا بھوک نے ستایا۔ کچھ ٹھنڈی مچھلی اور بمشکل ایک نان نگلا اور باقی اسی سندھ کے ایک سٹیشن پر رینگنے والے ایک اپاہج کے حوالے کیا، اور مجھے اس بوجھ سے نجات دلانے کا ثواب بھی اسی کو دے دیا۔

۱۹ دسمبر کی شام کو کوئی چار بجے میں کراچی سٹیشن پر جا اترا۔ بھائی عبدالرشید ایک ساتھی سمیت موجود تھے۔



مشرق کے ساتھیوں کے ساتھ

دائیں سے بائیں:۔ نذیرحق منوش کمار، گلزار شریف، محمد عباس

کراچی میں چند روز

۱۹ دسمبر ۱۹۸۰ء کو "تیز رو" سے کراچی پہنچا تو بھائی عبدالرشید رستم قلم اپنے ایک ساتھی سمیت موجود تھے۔ وہ شری غلام نبی ترمی تھے۔ ہم باہر نکلے تو دو اور مل گئے۔ چاروں ایک ٹیکسی میں کورنگی روانہ ہوئے میں نے زندگی میں کئی بڑے شہر دیکھے ہوں گے اور اگرچہ کراچی کی تعریف بہت سن چکا تھا لیکن وہاں جانے کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا۔ درو دیوار سے بالکل ناآشنا تھا اور انسانوں میں صرف دو سے دم بھر کی شناسائی۔ شہر میں داخل ہوئے تو سوچا کہ کچھ پان بندھوا لئے جائیں۔ ایک پنواڑی کی دوکان پر رُکے تو بالکل دلی اور لکھنؤ کے پرانے پنواڑیوں کا ماحول پایا۔ اُردو بازار کا ٹُنڈو پان والا سمجھو۔ وہ پنج نمازی نہیں جس کی پیشانی داغدار نہیں اور وہ پنواڑی نہیں جس کے ہاتھ کتھئی نہیں۔ ہر قسم کا پتا اور قسم قسم کا زردہ اور قوام پایا۔ ہاں الائچی اور لونگ کی کمی پائی۔ بولی بھی دلی اور لکھنؤ کی صاف ستھری، منجھی ہوئی۔ بھاری بھرکم حیدرآبادی یا آدھا تیتر آدھا بٹیر کلکتیا اُردو نہیں۔ کیا پان اور کیا زردہ۔ بہت سا مال ہندوستان سے آتا ہے کافی کچھ چوری چھپے پہنچتا ہے۔ آخر چلے اور لمبا راستہ طے کرتے شہر سے دُور کورنگی پہنچے۔ یہ اُن کالونیوں میں ایک ہے جو دلی کی طرح کراچی میں رفیوجیوں کے لئے بنائی گئی تھیں۔ کورنگی کو دلی کا اولڈ راجندر نگر سمجھئے۔ کوارٹر رقبہ کے اعتبار سے کھلے کھلے اور کمروں پر لوہے اور سیمنٹ کی چادریں یہاں کی طرح وہاں بھی پھلتے پھولتے کنبوں نے بڑھتی ضروریات پوری کرنے اور بڑھتے کرایوں کی مار سے

بچنے کے لئے کچھ چھوٹی موٹی تعمیرات خود بھی کھڑی کر لی ہیں۔ ایسا ہی ایک کوارٹر بھائی عبدالرشید کا مسکن ہے اور یہی میرا رین بسیرا تھا۔

دہلیز پر قدم رکھا تو عصر کی اذان ہوئی۔ ساتھیوں اور گھر والوں نے اُسے نیک شگون سمجھا اور دیکھتے دیکھتے حضرت بزمی کے دم کرم سے بزم جم گئی چونکہ اس صبح کے تمام اخباروں میں خبر چھپ چکی تھی کہ میں رستم قائم کی دعوت پر اس شام کراچی پہنچ رہا ہوں لہٰذا ملنے والوں کا آنا شروع ہو گیا۔ کئی آئے اُن میں جناب احمد حسینؔ ۔ بھی تھے جن کی زندگی بزم آرائیوں سے زیادہ رزم آرائیوں سے عبارت و آراستہ ہے۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں ہیں۔ دار و رسن کی آزمائش سے بھی گذرے ہیں اگرچہ اب بوڑھے ہیں تاہم دل بدستور جوان ہے۔ فرنگی اقتدار کے خلاف مسلسل جہاد کی روحانی تحریک شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی زندگی سے پائی تھی۔ پہلے شیخ العرب والعجم مجاہد اعظم حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے رنگ میں رنگے گئے پھر مولانا شبیر احمد عثمانی کے رنگ میں ڈبکی لگائی۔ آخر مفتی محمود کے سائے میں پناہ لی۔ اب کچھ آگے بڑھے نظر آتے ہیں۔

دل سے سمجھتے ہیں کہ روز اوّل سے پاکستان کے حکمراں ٹولے کی یہ کوشش رہی کہ حقیقی اسلام کی آواز کو کمزور تر کرتے ہوئے بالکل معدوم کر دیا جائے یہ حکمت عملی برطانوی دور کا ورثہ تھی اور مسلم لیگ میں ایسے عناصر کی بہتات تھی۔ فرماتے ہیں پاکستان کو چند معاہدوں کے تحت امریکہ کی جھولی میں دے دیا گیا۔ امریکہ سے درآمد شدہ ثقافت نے نوجوان نسل کو بے راہ روی کی ایسی راہ پر ڈال دیا جس کا انجام فحاشی، عریانی، بداخلاقی اور زیاں کاری کی انتہا ہے۔ حکومت کا نظام مکمل طور پر اس نوکر شاہی طبقہ کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے جسے انگریزوں نے اپنے طویل عہد حکمرانی میں پروان چڑھایا تھا ۱۸۵۷ء کے دستور کے ذریعہ جاگیرداری سرمایہ داری اور افسر شاہی کا ایسا گٹھ جوڑ پیدا کر دیا گیا جسے اسلام کی سند کے ساتھ پاکستان کے عوام پر ہمیشہ کے لئے مسلط رکھا جا سکے۔" کہتے ہیں قیام پاکستان کے دس برس کے اندر اندر اس کا آئینی اور عوامی مستقبل بالکل تاریک ہو چکا تھا کمیونزم کے ہوّے کو ہوا دی جا رہی تھی اور امریکہ کی گود میں پناہ حاصل کی جا رہی تھی۔ اسلام سیاست کا کھلونا بن گیا تھا اور ملک و ملت کے لئے بہتر اُمید کی کوئی روشنی باقی نہیں رہی تھی۔ صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ مولانا شبیر احمد عثمانی کی جانشینی کے مدعی حضرات اپنی نجی مصروفیتوں میں غرق ہو کر خاموش ہو چکے تھے چنانچہ

اس بھیانک خلاء کو پُر کرنے کے لئے مولانا احمد علی لاہوری کی معیت میں مولانا مفتی محمود ، مولانا غلام غوث ہزاروی اور علمائے حق کی ایک جماعت میدانِ عمل میں آگئی ۔ جب سکندر مرزا کی سیاسی دست درازیاں اسلام کے گریبان تک پہنچنے لگیں تو جماعت علماء کے مخلص حساس افراد نے شدّت کے ساتھ محسوس کیا کہ اب سیاست کے میدان کو خالی چھوڑ دینا پاکستان کے مستقبل کو کفر کی گود میں پھینک دینے کا جرمِ عظیم ہوگا ۔ کہنے لگے ۔ جمعیتہ العلماء اسلام کا قیام انہی حالات جذبات و احساسات کا نتیجہ تھا ۔

میں نے پوچھا کہ جمعیتہ العلماء اسلام نے پاکستان میں اصل اسلام لانے کی جو کوششیں کیں اور بھٹو کو کیفر کردار تک پہنچانے میں ضیاء کا جس طرح ہاتھ بٹایا ۔ ان سب کا جو نتیجہ نکلا ہے کیا اس سے آپ مطمئن ہیں ۔ وہ خاموش ہو گئے ۔ ادھر اُدھر کی کچھ اور باتوں کے بعد کمال صاحب چلنے لگے تو کتاب بعنوان "مولانا ابوالکلام آزاد نے برصغیر پاک و ہند (بنگلہ دیش) کے بارے میں کیا کہا تھا ۔" کا ایک نسخہ دستخط کر کے میرے حوالے کر گئے ۔ تصنیف ۱۹۷۲ء کی ہے ۔ پہلا باب یوں کھلتا ہے " ۲۵ سال بعد پاکستان کی تاریخ بدلنا شروع ہو گئی ہے اور ان ۲۵ سالوں میں جنوبی ایشیاء کا سیاسی نقشہ یکسر بدل چکا ہے ۔

برصغیر اور پاکستان کی حالیہ تبدیلیوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد کو تازہ کر دیا ہے ۔ آج بیشتر زبانوں سے یہ جملہ سننے میں آرہا ہے کہ "مولانا ابوالکلام نے جو کچھ کہا ہے وہ سب کچھ درست ثابت ہو رہا ہے ۔"

کمال نہایت بے باکی سے رقمطراز ہیں ۔

" پاکستان کے مسلمان آج ایک نہایت ہی شدید ذہنی کرب و اضطراب اور فکری اندوہ اور تشویش کے دور سے گذر رہے ہیں اُن کی تمام اُمیدیں ایک ایک کر کے مسمار ہو چکی ہیں صرف ۲۵ سال کے مختصر عرصہ میں وہ اپنے وطنی وجود کا نصف حصّہ کھو چکے ہیں اور باقی نصف حصّہ میں علاقائی افتراق کے خطوط کو اُبھرتا دیکھ رہے ہیں ۔ برصغیر کے مسلمانوں کی ملّی وحدت کے وجود کا جو نظریاتی ہیکل انہوں نے تعمیر کیا تھا ۔ وہ تقسیم در تقسیم کے پیہم تاریخی اور سیاسی عمل کے ذریعہ پارہ پارہ ہو چکا ہے ۔"

" اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ذہنی اور جسمانی صدمہ ان مسلمانوں کو پہنچا ہے جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں آباد تھے اور حصولِ پاکستان کی جنگ میں سب سے پیش

پیش سے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ تقسیم ہند کے بعد وہ لاکھوں کی تعداد میں اپنا پیدائشی وطن ترک کرنے پر مجبور ہوئے۔ اور اب ۲۵ سال کی خانہ ویرانی و خانہ بدوشی کے بعد، مشرقی پاکستان کی علیحدگی و خاتمہ کے سانحہ نے اُن کے مستقبل کو ایک بار پھر بے یقین بنا کر رکھ دیا ہے۔ آج جس سرزمین پر اُن کے گھر ہیں وہ سرزمین بھی اُنکے اپنے پاؤں تلے سے نکلتی معلوم ہو رہی ہے"

"آج وہ اپنے ماضی پر نالاں، اپنے حال پر گریاں اور اپنے مستقبل کے بارے میں پریشان ہیں۔ اور ایسے مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے کسی منزل کی طرف کوئی راہ نہیں جاتی اور وہ جاننا چاہتے ہیں کہ ابوالکلام کے افکار کی مسیحائی میں اُن کی موجودہ مہلک بیماری کا بھی کوئی تیر بہدف علاج موجود ہے۔ کمال آخر میں سوال کرتے ہیں" کیا اب وہ وقت نہیں آگیا ہے کہ برصغیر کی مسلمان ملت ۲۵ سال کی محرومیوں اور ذلتوں کے بعد، اپنے مسترد کئے ہوئے مسیحائے ملت کی فکر اور دعوت کی طرف رجوع کرے اور تاریخ کے ایک نئے دور کا سنگ بنیاد رکھ دے ؟

دُنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

بعدازاں میں نے سنا کہ کمال کی متذکرہ بالا کتاب سندھ میں ضبط ہے۔ رام جانے سچ کیا ہے۔

کمال رخصت ہوئے تو دسترخوان بچھا۔ گھروالے شاید دن بھر تیاری میں رہے تھے۔ قیمہ اور قورمہ اور کوفتہ اور کباب — سب کچھ تھا، اُسے میری کور ذوقی سمجھئے کہ گوشت سے کبھی رُچی نہیں ہوئی۔ ڈھیروں سبزیاں بھی تھیں اس لئے کام چل گیا۔ محفل ملتوی اور خواب گاہ میں ایک میں اور ایک میرا بزمی رہ گیا۔ کیا قلندر ہے۔ بے نیاز، بے پرواہ اور بے باک۔ ہم نہ جانے کون کون سے مسئلوں پر باتیں کرتے رہے۔ اور اب کیا سناؤں رات گئی رات کی بات گئی۔

۲۰، دسمبر کو صبح نکلے تو سب سے پہلے جنگ کے دفتر پہنچے۔ اشاعت کے اعتبار سے یہ پاکستان کا سب سے بڑا اخبار ہے۔ دوسری جنگ کے زمانے میں میر خلیل الرحمان صاحب نے دلی میں شروع کیا تھا۔ تقسیم کے ساتھ کراچی منتقل ہو گیا۔ میر صاحب کی معاملہ فہمی اور کاروباری صلاحیتوں نے اُسے جلد ہی ملک کا ایک ممتاز روزنامہ بنادیا

سیمابی سیاست نے ہزار نشیب و فراز دیکھے ۔لیکن 'بلٹز' کے شری کرنجیا کی طرح میر صاحب نے ہر وقت کے ماحول کو سونگھ لینے کی کمال صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور حکومت خواہ کسی کی رہی، اُن کے ہمیشہ پو بارہ رہے، بے شک ہندوستان میں بڑے بڑے اخبار ہیں۔ اور کئیوں کے بڑے بڑے، شاندار دفتر ہیں۔ مدراس میں 'ہندو'، کلکتہ میں اسٹیٹسمین اور آنند بازار پتریکا 'بنگلور میں دکن ہیرلڈ'، بمبئی اور دلّی میں 'ٹائمز آف انڈیا' نیز دلی میں 'ہندوستان ٹائمز' اور انڈین ایکسپریس کی عمارتیں نہایت ہی شاندار سمجھی جاتی ہیں لیکن ماننا چاہیئے کہ کراچی میں جنگ کی عمارت بھی ایک نگین حصار ہے۔ رکھ رکھاؤ بھی قابلِ تعریف ہے۔ عمارت میں قدم رکھا تو داہنی طرف موہنجو دارو میں برآمد مورتیوں اور مہروں کے نمونے دیکھے پاکستانی اپنے اسلامی حال کے ڈانڈے مشرکانہ ماضی بعید سے ملانے میں فخر محسوس کرتے



ہیں۔ بھائی عبدالرشید جنگ میں ہی کام کرتے ہیں۔ اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو وہی پٹنہ والے بشیر الحسن پہلے سے موجود تھے۔ کہنے لگے کل سٹیشن پر بھی تھا لیکن پہچان نہ پایا تھا۔

چائے کے پیالے پر میں نے رات ان کے ہاں جام الفت چڑھانے کا وعدہ کر لیا۔

رستم قلم نے مجھے پہلے تو جرنلسٹوں اور خوشنویسوں سے متعارف کرایا اور پھر میر خلیل الرحمان کے بیٹے اور ادارے کے مہتمم میر جاوید الرحمان سے ملایا۔ میر صاحب اس روز اسلام آباد میں تھے۔ وہ ہوتے تو کچھ اور بات ہوتی۔ بہر حال جاوید سے مل کر بھی طبیعت خوش ہو گئی۔ حسن اور عقل و سلیقہ اور نفاست کا مرقع۔ انہوں نے صحافت کی تربیت انگلستان میں پائی تھی۔ املک ناک میں نیوز پیپر انڈسٹری کا کیا حال ہے اس پر بات چیت ہوتی رہی۔ کہنے لگے ہمارا یقین ہے کہ اخبار کو بہتر سے بہتر بنانے کا بنیادی طریقہ یہ ہے کہ کام کرنے والوں کو ہر وقت جتنا نہ رہے اتنا ملے کہ وہ سب تفکرات سے بے نیاز ہو کر دل و جان سے ادارے اور اس کی وساطت سے پورے سماج کی خدمت کریں۔ کہنے لگے کہ روزنامہ جنگ کی اشاعت زائد از تین لاکھ اور ہفت وار "اخبار جہاں" کی اشاعت کوئی چار لاکھ ہے ایک اخبار لندن سے بھی نکل رہا ہے بتانے لگے کہ نستعلیق کے ٹائپ کی تیاریاں جاری ہیں۔ اور انشاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب "جنگ" نستعلیق ٹائپ سے چھپا کرے گا۔ ہندوستان کے بعض انگریزی رسالوں کی بہت تعریف کرنے لگے "پرتاپ" کا ذکر آیا تو اس کی بے باکی کے معترف ہوئے۔

پاکستان میں سنسر نے کیا کر رکھا ہے۔ یہ میں تفصیل سے سن چکا تھا۔ اب یہ آزادی صحافت کا دکھڑا اور سننے اور وہ بھی کس کی زبان سے۔ اس میں کوئی تک نہ تھی۔ میں نے پوچھا تک نہیں۔

وہاں سے بزمی سمیت نکلا اور پریس کلب کا رخ کیا۔ کراچی پریس کلب ایک سبزہ زار میں کھڑے ایک دو منزلہ بنگلہ میں ہے۔ بیشک دلی، کلکتہ، بمبئی، بنگلور، اور لکھنؤ، بھوپال میں ہماری پریس کلبیں بھی سبزہ زاروں میں ہیں۔ لیکن کراچی پریس کلب جتنی بڑی عمارت کہیں بھی نہیں۔ وہ صرف کلب ہی نہیں اس کی لائبریری بھی خوب ہے۔ دل خوش ہو گیا۔ وہاں کئی اخبارو کے جرنلسٹ موجود تھے ملے لیکن نہ جانے کیوں پہلے روز کھل نہ سکے۔ کچھ جھینپتے رہے۔ شاید اس لئے کہ ان کے لیڈر نہ تھے یا شاید مجھے تول رہے تھے۔ کہنے لگے کل ضرور آئیے کھانا بھی یہیں کھائیے۔ لیڈر بھی ہوں گے۔ بہت سے ہوں گے۔ میں نے اجازت لی۔ اور ساتھی سمیت براستہ 'جنگ' مزید ساتھیوں کو لیتے 'گل رنگ' کا رخ کیا۔ جہاں انجمن فروغ خطاطی کی طرف سے ایک استقبالیہ کا انتظام تھا۔ یہ شاندار ریستوران ایک وسیع سبزہ زار میں ہے۔ بڑے ہال

میں چائے کا انتظام تھا۔ میں نے ایرکنڈیشنڈ ہال کے بجائے سبزہ زار پر ہی وقت گذارنے کو کہا تو جواب ملا" اجازت نہیں ہے"۔ ایسا استقبال ہوگا یہ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ وہاں تو ہر اخبار کے نمائندے اور کتنے ہی فوٹوگرافر اور نہ جانے کون کون موجود تھے میں نے بیٹھنے کے لئے ایک کرسی چنی تو مجھے ایک خاص نشست سنبھالنے کا مشورہ دیا گیا۔ خیر تقریریں شروع ہوئیں۔ شری انیس الحق عثمانی، شری حفیظ حسین، شری اقبال احمد صدیقی شری وامق اور آخر میں رستم قلم نے تقریریں کیں۔ شاید کچھ اور بھی بولے۔ ہر ایک نے بھارت اور پاکستان کے باہمی تعلقات بڑھانے کی ضرورت پر زور دیا۔ یہ بھی بتایا کہ حکومت پاکستان اس سلسلہ میں کیا کچھ کر رہی ہے۔ شری صدیقی نے بتایا۔ کہ اُن کی حکومت کی کوششوں کے نتیجے میں کئی لاکھ پاکستانی ان دو برسوں میں ہندوستان اپنے عزیز و اقارب سے مل کر آئے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

استقبالیہ میں موجود۔ ایک صدارتی اعزاز یافتہ شاعر آرزو اکبر آبادی نے فی البدیہہ چند شعر کہہ دیئے۔ ایک آپ بھی سنئے سر بے شک نہ دھنئے۔

ہ آرزو دل کا سفینہ زیب ساحل ہوگیا
دیکھ کر سنتوش کو سنتوش حاصل ہوگیا

ایک کے بعد دوسرے کی زبان سے محبت کے چرچے سُن کر وفورِ جذبات سے میرا دل بھر آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور پھر انہوں نے مجھے کچھ کہنے کو کہا تو رندھی ہوئی آواز اتنی مدھم پڑگئی کہ کسی کے کچھ پلے نہ پڑا۔ آخر سنبھلا اور بتلایا کہ لاہور کے ساتھ کراچی آنے کا پروگرام کیسے بنا۔ سرحد پر دونوں طرف کے افسر جس محبت سے پیش آئے۔ لاہور میں 'مشرق' والوں نے



دائیں سے بائیں: عثمانی، شفیع، عبدالرشید رستم قلم، سنتوش کمار، وامق

ل پیار سے سنبھالا۔

چونکہ یہ جلسہ انجمن فروغ خطاطی کے زیر اہتمام تھا۔ لہذا مناسب تھا کہ اس فن قدیم



بچپن کی یاد دوستوں نے رُلا دیا

کے بارے میں کچھ کہوں۔ جب تک اُردو ٹائپ کا چلن عام نہیں ہوتا اور اخبار جب تک موجودہ حالت میں چھپتے رہیں گے خطاطی کو اُردو صحافت میں ایک مخصوص مقام حاصل رہے گا۔ ہر ایک اُردو صحافی کے لئے خطاطی کے بارے میں کچھ نہ کچھ جاننا لازم ہے۔ لہٰذا میں نے سپین کی مسجدوں سے لے کر انڈونیشیا کی مسجدوں تک میں خطاطی کے نمونوں کے بارے میں جو تھوڑا بہت پڑھا تھا اس کا ذکر کر دیا۔ ابجد کی تحریر یمن میں شروع ہو کر کوفہ میں حضرت علی کے ہاتھوں جِلا پا کر اسلام کے ساتھ ایران کیسے پہنچی اور ایرانیوں نے مصوری ممنوع قرار پانے کے بعد اپنے ذوقِ جمال کی تسکین کے لئے کیسا پری چہرہ خطِ نستعلیق ایجاد کر لیا۔ پھر وہیں سے امام ویرزی کا لاہور آنا اور وہاں اپنے فن کا مظاہرہ، اور وہیں ایک کانوں کے کچے جاہل نواب سے ان کی چپقلش کی داستان اور لاہور، دلی، لکھنؤ اور حیدر آباد کے اسالیب خطاطی کی نوک پلک کا فرق بیان کر دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ اگر ہر خط کا نمونہ اس روئے زمین پر ایک ہی مقام پر دیکھنا ہو تو اس مقدس مقام کی زیارت کیجئے۔ جہاں امام حسین کا مزار ہے۔ پوری داستانِ شہادت تو نہیں خراجِ عقیدت اور خراجِ تحسین ابجد کے ہر رسم الخط میں ضرور پاؤ گے۔ میں بول چکا تو ایک صاحب پوچھ بیٹھے کہ پاکستان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ظاہر ہے کہ میں وہاں سیاست پر بحث کے لئے نہ گیا تھا۔ اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ ہم فقط طالب علم اور مبصر ہیں۔ اور ہر ریاست کو ایک لیبارٹری سمجھ کر ہر ایک کا تجربہ دیکھ رہے ہیں۔ شمالی اور جنوبی کوریا سے لے کر ترکی تک کے تجربے آپ کے سامنے ہیں۔ عراق، ایران، اور افغانستان کے تو بالکل سامنے ہیں۔ ہم ریاستِ ہند میں لبرل ڈیموکریسی کا تجربہ کر رہے ہیں اور اُسے فیل نہیں سمجھتے۔

پاکستان میں جو تجربہ ہو رہا ہے ہم سب جانتے ہیں۔ سب ریاستیں ایک دوسرے کے تجربے سے فیض پانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ہم نے برطانوی نظام سے فیض پایا ہے۔ پاکستان کسی دوسرے کے تجربے سے کتنا فیض پاتا ہے اس کے حکمراں کی فہم و فراست و حکمت و تدبر پر منحصر ہے۔ معاملہ یہیں ختم ہو گیا۔

محفل برخاست ہوئی تو نہ جانے کس کس نے آگے بڑھ کر تصویریں کھنچوائیں ایک نے کان

میں یہ بھی کھُپسایا کہ جہاں میں بیٹھا تھا اس میز کے نیچے ٹیپ ریکارڈر لگا تھا خیر جو کچھ بھی تھا وہ تقریب یقیناً یادگاری تھی۔

شام ہو چکی تھی اور بشیر الحسن اس اُمید میں تھے کہ کب فرصت ہو تو مجھے اپنے گھر لے چلیں وہ رات ناظم آباد میں اُن کے ساتھ گذری۔

--

تثلیث شہادت

۲۱ر دسمبر ۱۹۸۰ء کو صبح سویرے جب کراچی کے ناظم آباد میں بشیر الحسن کے گھر نیند کھلی تو کچھ زیادہ اندھیرا پایا۔ ادھر ادھر وہاں تو خوب پانی برس رہا تھا پھر گھن گرج سنائی دی پچھلی شام ہی موسم بگڑنے لگا تھا لیکن یہ خیال نہ تھا کہ کوئٹہ کی ہوائیں کراچی میں یہ رنگ لائیں گی۔ گل رنگ میں سہاونی شام کے بعد رنگ پر رنگ جمائیں گی۔ اس ٹھٹھرن میں بھی ٹھنڈے پانی سے اشنان کر لیا۔ ناشتہ بھی وہ ملا جو عمر بھر یاد رہے۔ نمکین بھی اور میٹھا بھی۔ "نالے دو دو نالے چوپڑیاں"۔ پانی برستا رہا اور میں کبھی کچھ پڑھتا رہا اور کبھی کھڑکی سے باہر تکتا رہا۔

کوئی ۹ بجے بشیر بھائی کے بیٹوں کے ساتھ انہی کی گاڑی میں سوار ہو قریبی بس سٹینڈ تک پہنچا۔ کرنی خدا کی ایسی ہوئی کہ منٹ منٹ کرتے تیس منٹ گزر گئے۔ پانی برستا رہا لیکن بس کوئی نہ رکی۔ گاڑی میں پٹرول کم، شہر تک پہنچے تو کیسے پہنچے۔ آخر طے پایا کہ گھر لوٹا جائے۔ اور ممی سے پیسے لئے جائیں یا دوسری گاڑی نکالی جائے۔ ہم گھر پہنچے تو پھر جلد نکلنا کیسا؟

ایک پروفیسر صاحب اخباروں میں پڑھ کر اس بارش میں بھی ڈھونڈتے ڈھانڈتے مجھے ملنے آئے وہ کبھی الہ آباد یونیورسٹی میں ترکی زبان پڑھتے تھے۔ اب کراچی یونیورسٹی میں تاریخ اسلام و زبان ترکی کے استاد ہیں۔ ہنس مکھ ہیں، ملنسار ہیں۔ خوب ہیں۔ پہلی نظر میں بھلے

اپنی کتاب اور ایک رسالہ پیش کرنے آئے تھے۔ کتاب کیا کوئی معمولی کتاب ہے۔ دنیا بھر کی ترکی اردو کی پہلی ڈکشنری تیار کرنے والے یہی ڈاکٹر محمد صابر صاحب ہیں۔

ترکی پڑھنے کا شوق انہیں استنبول لے گیا۔ جدید ترکی کے بارے میں کچھ استفادہ عصمت انونو سے بھی پایا۔ محنت شاقہ اور عرق ریزی کا ثمر یہ پایا کہ ڈکشنری تیار کرنے والے دنیا بھر کے چیدہ چیدہ حضرات میں نام پایا ہے۔ ڈکشنری میں ۲۰ ہزار ترکی لفظوں کے اردو معنی دیئے گئے ہیں جسے ترقی اردو بورڈ (کراچی) کے اشتراک و معاونت مالی سے لائبریری پروموشن بورڈ (کراچی) نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا تھا۔ پنڈت ہری چند اختر مرحوم کے خاص مداحوں میں شامل جناب ممتاز حسن ستارہ پاکستان سے منسوب ہے۔

ترکی کو محض موجودہ ریاست ترکی کی زبان مت سمجھئے۔ دنیا کے تقریباً ۲۶ علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ اور ۱۰ علاقوں میں اسے قومی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ کم و بیش گیارہ بارہ کروڑ ترکی النسل انسانوں کی زبان ہے۔ جو سائبیریا میں ولاڈی واسٹک سے لے کر یوگوسلاویہ میں بلگریڈ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ سوویٹ روس کی مسلم جمہوریتیں ازبکستان، قرغزستان، قازقستان، ترکمانستان، اور افغان: ترکستان، (شمالی افغانستان) خراسان، آذربائیجان (شمالی مغربی ایران) اور ترکیہ، عراق، شام، اور سائپرس کے کروڑوں مسلمان ترکی ہیں اور ترکی ہی اُن کی مادری زبان ہے۔

ترکی بڑی قدیم زبان ہے جسے مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے اور اُسے لکھنے کے لئے مختلف رسم الخط کام میں لائے جاتے رہے ہیں۔ اولغور، صغدی چینی، تبتی، (بنیاد سنسکرت) نسطوری، سریانی، اور برہمی/برہنی (سنسکرت رسم الخط کی مغربی شاخ سے تعلق رکھتا ہے اور ماہرین کے مطابق توخاری رسم الخط سے ملتا ہے) — آخر عربی رسم الخط اسلام لانے میں مقبول ہوا اور اسلام کے ساتھ ساتھ خوب پھیلتا گیا اب رومن رسم الخط مروّج ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ رومن جہاں جہاں پہنچے، زبان کے ساتھ ساتھ رسم الخط بھی لے گئے۔ یہ اُس دَور کی بات ہے جب رُوم مسیحیت کے جھنڈے تلے نہ آیا تھا جب آیا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس نے بساطِ عالم پر کیا کیا گل کاری کی، اور کہاں کہاں کیا کیا گل کھلائے یہی رومن رسم الخط بعد ازاں مفتوحہ مقامات و ممالک کی زبانوں

کے لئے بھی استعمال ہونے لگا۔

اسی طرح عرب بھی جہاں جہاں پہلے اپنی زبان اور اس کا مروّجہ رسم الخط لیتے گئے اور یہی عربی اور سامی ابجد اور مروّجہ رسم الخط کا رواج پھیلتا گیا اور مفتوحہ مقامات و ممالک کی زبانوں کے لئے بھی استعمال ہونے لگا۔ ترکی اور ہندی اس کی واضح مثالیں ہیں۔

پروفیسر صاحب رقمطراز ہیں۔ "اردو زبان بنیاد کے اعتبار سے ایک آریائی بھاشا ہے۔ لیکن اس نام سے یہ صرف ترکوں کے دور ہی میں نوازی گئی ورنہ اس کے اور بہت سے نام تھے۔ کوئی اسے ہندی بھاشا کہتا کوئی ہندی کہتا اور کوئی سراسینی"۔

"ترکی میں عرب اقتدار کے خاتمہ کے بعد خلفائے عثمانیہ نے سرکاری زبان عربی سے بدل کر ترکی کر دی تھی" کمال کا کمال یہ ہے کہ اس نے مادرِ وطن کو جہالت موسومہ و ملقب بہ خلافت کے ظلمت کدے سے نکال یوروپ کی روشن خیالی سے منوّر کرنے کا سہل ترین نسخہ یہ تجویز کیا کہ ایک ہی ضرب غزنوی سے عربی رسم الخط کا مبینہ مقدس بُت ڈھاکر اللہ کے بجائے وقت کے سلطان کو سجدہ کرنے والے مُلاؤں کو بے دست و پا کر دیا۔ پیران کلیسا کو کلیسا سے ہٹایا تو نہیں البتہ انہیں کلیسا میں بند کر کے ریاست کو ان کی دست بُرد سے بچا لیا۔

پروفیسر محمد صابر کا رسالہ دیوان بیرم خاں خانخاناں بھی پُر از معلومات ہے اتالیق اکبر کے فارسی و ترکی کلام کے مختلف مرحلوں پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ان کے حُسن و تدبّر کو کھل کر خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے۔ بیرم خاں خود شیعہ تھا اور غالباً اسی لئے جب ہمایوں جلاوطن ہوا تو اس کی مدد کے لئے ایران کے صفوی شیعہ حکمراں طہماسپ تک جا پہنچا اور جب شاہ نے مدد کے لئے یہ شرط لگادی کہ ہمایوں شیعہ مذہب قبول کر لے تو بیرم خاں نے کس چالاکی سے ایک طرف طہماسپ کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کیا کہ مذہب کا معاملہ ذاتی معاملہ ہے اور دوسری طرف ہمایوں کے کان میں پھونک دیا کہ اگر پھر سے تخت و تاج چاہتے ہو تو مان جاؤ۔

بارش تھم چکی تھی اور پروفیسر صاحب کو بھی اور مجھے بھی اپنے اپنے کام سے دیر ہو رہی تھی۔ کہنے لگے کہ ہم فلاں فلاں زبانیں پڑھانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ میں پوچھ بیٹھا کہ آیا قدیم زبانوں میں کہیں سنسکرت کا نمبر بھی آتا ہے۔ "بولے نہیں" ہاں اب ہندی کچھ کچھ شروع کر رہے ہیں۔ کہاں سنسکرت، کہاں ہندی، بھلا انہیں کون بتائے کہ سنسکرت

کا ہندی سے کیا تعلق ؟ آخر ہم دونوں نے ایک دوسرے سے اجازت لی اور پھر میں نے گھر والوں سے دوسری بار اجازت لی۔ بشیر صاحب کے بیٹوں نے مجھے دوسری گاڑی میں سوار کیا اور ہم لمبا راستہ طے کر کے دفتر 'جنگ' کے قریب آ پہنچے۔ میں نے بچوں کو پیار کر کے جلد گھر پہنچنے کا مشورہ دیا اور خود ایک قریبی ریستوران میں داخل ہو سپیشل چائے کا آرڈر دیا۔

کچھ کاغذ نکالے کچھ پتے تلاش کئے اور تازہ دم ہونے کے بعد رکشا میں سوار ہو کر ایک جگہ پہنچ اور وہاں سے دوسرا رکشا پکڑ صحیح جگہ پہنچ گیا۔ پہلے دو ملے پھر ایک ایک کر کے کچھ اور آ گئے جب میری شناخت کر لی تو کھلنے لگے حکومتِ وقت کے لتے لینے لگے۔ میں نے کہا اِن سب باتوں کو چھوڑو بہت سُن چکا ہوں کہ سرکار نے یہ کیا، سرکار نے وہ کیا۔ زبان بندی کر دی۔ قلم پر روک لگا دی جلسے جلوس بند، سب کچھ بند— سَب مانا لیکن کوئی ٹھوس شکایت بیان کرو تو بات بنے۔

بولے "تو سنو! ابھی کچھ مہینوں کا واقعہ ہے۔ اگست ۱۹۸۰ء میں جنرل ضیاء الحق اور سندھ کے گورنر لیفٹننٹ جنرل ایس ایم عبّاسی کی ہدایت پر فوج کے ایک خصوصی شعبے، فیلڈ انویسٹی گیشن یونٹ نے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے پانچ کارکنوں کو کراچی میں گرفتار کر لیا اُن پر الزام لگایا گیا کہ وہ پاکستان کی سالمیت کے خلاف تخریبی مواد شائع کر رہے ہیں۔ ان کے قبضہ سے مبینہ طور پر برآمد ہونے والے مواد میں "سُرخ پرچم" کے شماروں اور ایک سائیکلوسٹائیلنگ مشین کو شامِل بتایا گیا ہے۔ ان پانچوں گرفتار شدگان کو فوجی ماری پور کے ہوائی اڈّے پر قائم ایک خصوصی تفتیشی مرکز میں لے گئے جہاں انہیں طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچائی گئیں تاکہ اُن سے روپوش کمیونسٹ کارکنوں کے بارے میں اطلاعات اور اُن سے جھوٹے اقبالی بیان حاصل کئے جائیں۔ فوج کے ٹارچر کی تاب نہ لا کر پارٹی سنٹرل کمیٹی کا ایک رکن نذیر عباسی کراچی میں ۱۱ اگست کو شہید ہو گیا فوج نے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لئے اس کی لاش اس کے رشتہ داروں کے حوالے بھی نہ کی۔ بلکہ لاوارث قرار دے کر راتوں رات ایک قبرستان میں دفنا دی۔

ہائیکورٹ میں مقتول کی بیوہ حمیدہ عباسی کی رٹ درخواست پر سرکاری وکیل نے یہ ظاہر کیا کہ نذیر عباسی پولیس کی حراست میں طبعی وجوہ کی بنا پر انتقال کر گیا تھا لیکن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

کراچی کی عدالت میں نعش کو برآمد کرکے پوسٹ مارٹم کرانے کی درخواست پر جو رسمی کارروائی ہوئی اس کے دوران پولیس کانسٹبلوں اور انسپکٹر نے متضاد بیانات دیئے اور کہا کہ یہ لاش ہسپتال سے ان کے حوالے کی گئی تھی۔ کہنے لگے کہ فوجی حکومت میں فوجیوں کو عدالت کے کٹہرے میں کون لاکھڑا کرسکتا ہے تاہم شہید نذیر عباسی کی بیوہ نے ایک ایف آئی آر درج کرائی جس میں اپنے شوہر کے قاتلوں میں انہوں نے ضیاء الحق اور لیفٹننٹ جنرل عباسی کا نام لیا۔ جن کی ہدایت پر فوجیوں نے اُن کے شوہر کو مار ڈالا۔ دیگر چار قیدیوں کو جن میں پروفیسر جمال نقوی جو ایک زمانہ میں نیشنل عوامی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ممبر تھے۔ شبیر شر جو ایک سندھی طالب علم ہے۔ سندھ ٹائمز کے نیوز ایڈیٹر سہیل سانگی اور ایک کارکن احمد کمال وارثی شامل ہیں۔ لانڈھی جیل میں قید تنہائی میں رکھا ہوا ہے۔ کسی کے رشتہ داروں کو اُن سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ نہ ہی وہ آپس میں یا کسی اور قیدی سے مل سکتے ہیں۔ اُن پر مقدمہ ایک خصوصی فوجی عدالت میں چلایا جانا ہے۔ لیکن اب تک یہ مقدمہ شروع نہیں کیا گیا ہے۔ انہیں اپنے وکیلوں سے ملنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ اُن کامریڈوں نے مزید بتایا کہ نذیر عباسی کی شہادت پر سندھ کے مختلف تعلیمی اداروں میں پروٹسٹ جلسے ہوئے۔ وکلاء کی کنونشن نے بھی اس کی مذمت کی۔ مختلف سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں دانشوروں اور وکیلوں نے مشترکہ بیان میں اس بہیمانہ اقدام کی مذمت کی۔ لیکن پاکستانی اخبارات میں ایک سطر بھی شائع نہ ہوئی۔ کہنے لگے کہ اگر یونیورسٹی جانا ہو تو دیکھو گے کہ ایک بینر اب تک لہرا رہا ہے جس پر "شہید نذیر عباسی کے قاتل فوجیوں کو سزا دو" کا نعرہ لکھا ہے وہ یہ افسوسناک واقعہ سُنا چکے تو میں نے پوچھا کہ اب حال کیا ہے۔ پارٹی ورکروں میں کچھ دم ہے یا دم ٹوٹ چکے ہیں۔ جواب آیا وہ کمیونسٹ ہی کیا جو دموں کا گاڑھا نہ ہو۔ ہم دبے ہوئے ہیں۔ اور اس ضیاء کی حکومت میں کیا۔ روزِ اوّل سے ہی اس ملک میں دبے ہوئے ہیں۔ لیکن دم ٹوٹنے کی کوئی وجہ نہیں۔ شعور جس رفتار سے بیدار ہوگا ہم دُگنی رفتار سے اُٹھیں گے سر ظالم کو یاد رکھنا چاہیئے۔ ؎

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

کچھ ہندوستانی کمیونسٹوں کا پوچھتے رہے کتنا بڑھے ہیں؟ کہاں کھڑے ہیں۔ کچھ بنگلہ دیش کی حالت کا دکھڑا سنایا۔ وہاں کیا سے کیا ہو گیا۔ سوچا تھا کیا کیا ہو گیا؟ کوئی ایک گھنٹہ گذارنے کے بعد میں نے اُن کامریڈوں سے بھی اجازت لی اور دفتر جنگ لوٹا۔ ایک جگہ پان خریدنے اُترا

تو پتواڑی کے ساتھ کیلنڈر لے کر کھڑا ایک نوجوان تصویریں اور کیلنڈر بیچ رہا تھا۔ بھٹو پریوار کی چھوٹی چھوٹی تصویریں بھی تھیں ایک میں نے بھی خرید لی۔ آپ بھی دیکھئے۔ دفتر جنگ میں یار بزمی پہلے سے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اُسے دوسری رات ساتھ نہ گذارنے کا افسوس رہا تھا۔

کھُلے موسم میں پریس کلب پہنچے تو وہاں کئی جرنلسٹ موجود پائے۔ کراچی میں اُردو انگریزی اور سندھی اخباروں کے نیز اسلام آباد اور کہاں کہاں کے اخباروں کے نمائندے جرنلسٹ یونین اور پوری صنعت کی ٹریڈ یونین تال میل کمیٹی کے لیڈر بھی۔ ایک سے ایک بڑھ کر۔ وہاں کیا سُنا اور کیا سُنایا سنئے۔



کراچی کے بازار میں بکنے والی
بھُٹو پریوار کی ایک ممنوعہ تصویر

ایک موازنہ

یہ تو آپ سُن ہی چکے ہیں کہ ۲۱ دسمبر ۱۹۸۰ء کو صبح کی مصروفیات کے بعد کس طرح دفتر جنگ سے یار بزمی کو ساتھ لیے کھلتے موسم میں بلکہ دھوپ چھاؤں کے کھیل میں کراچی پریس کلب پہنچا تھا وہاں تو بہت سے موجود تھے۔ کراچی کے انگریزی اُردو اور سندھی اخباروں کے جرنلسٹ نیز راولپنڈی اور کہاں کہاں کے اخباروں کے نمایندے۔ کُل اخباری صنعت کی ٹریڈ یونین تال میل کمیٹی کے لیڈر — ایک سے ایک بڑھ کر۔

کلب کا ہال بھر گیا اِدھر اُدھر سے کچھ اور کرسیاں گھسیٹی گئیں پھر بھی کچھ کھڑے رہے۔ پہلے تو گویا مجھ پر جرح شروع ہوگئی۔ "ذرا بتاؤ! ایمرجنسی میں آپ کے ہی تو سنسر لگا تھا۔ آپ کہاں تھے۔ آپ نے کیا کیا تھا؟" میں نے پہلے تو اپنی انڈین فیڈریشن آف ورکنگ جرنلسٹس کے کردار کا دامن دراز کیا کہ دیکھ لیں کہیں داغدار تو نہیں ہے اور پھر اطمینان دلایا کہ اگر چاہو تو دلی لوٹتے ہی پہلی ڈاک سے اس میمورنڈم کی نقل روانہ کر دوں گا۔ جو سنسر لگنے کے دس روز کے اندر اندر پردہان منتری کو پیش کیا گیا تھا اور اگر پھر بھی کچھ اور چاہو تو اُن تمام ریزولیشنوں کی نقول بھیج دوں گا جو ہم نے اس پوری مدت میں موقعہ بہ موقعہ ڈنکے کی چوٹ پر پاس کئے تھے اور سائیکلو اسٹائل کر کے بانٹے تھے" اور پھر" میں نے کہا" یہ مت بھولئے کہ اس سنسر کی سزا شریمتی گاندھی کو کیا ملی تھی۔ راج پاٹ سے بن باس اور مقدموں کا الگ طومار۔ ایک حوصلے کے سوا سب چھوٹ گئے تھے بہت سے ساتھی ٹوٹ گئے تھے۔ کل تک سلام کرنے والے کلام تک حرام سمجھنے لگے تھے۔ مال تو مال بیٹے تک کی راہ میں آنکھیں بچھانے والے آنکھیں چُرانے لگے تھے۔ طوطا چشم تو آنکھیں تک دکھانے لگے تھے اور کم ظرف مُنہ کو آنے لگے تھے اور وہ "بس ایک تیرا سہارا" لے کر پورب پچھم اُتر دکن کے مندروں میں بھٹکتی



سنتوش کمار پریس کلب میں پاکستان نیوز پیپر ایمپلائز کنفیڈریشن کے لیڈروں
مسٹر منہاج برنا اور عبدالحمید چھاپڑا سے تبادلہ خیال کر رہے ہیں

رُوح پکار اٹھی تھی ؎

"گردشِ ایام تیرا شکریہ میں نے ہر پہلو سے دُنیا دیکھ لی"

جگہ جگہ وعدہ کرتی پھری تھی۔ "خدمتِ وطن کے لئے حکومت تو پھر بھی چاہوں گی۔ لیکن حکومت قائم دائم رکھنے کے لئے ایمرجینسی اور سنسر بھول کر بھی نہ لگاؤں گی"۔

"پر وہاں الیکشن ہوئے تو تھے" اُن میں سے ایک بول اُٹھا۔

"یہ کریڈٹ تو مسز گاندھی کو ملنا ہی چاہئے کہ انہوں نے چناؤ کرائے۔ ہار گئیں تو بلا چوں و چراں بلکہ برضا و رغبت قلمدانِ وزارت نئے وزیر اعظم کو سونپ دیا اور یہ عالی ظرفی کہ دشمن خوش بخت کی کامیابی کے لئے دُعا تک کر دی بے شک مسز گاندھی کے عروج و زوال اور عروجِ نو کی کہانی ریاست ہند کے جمہوری مزاج کی آئینہ دار اور عینی شہادت ہے۔ پر یہاں الیکشن کرائے تو کون؟ اور آخر کیوں؟ اصل اسلام لانے کے نام پر جو بھی کج ادا خنجر بدست چڑھ بیٹھا، نہ جانے کس خطا کی سزا دینے کے لئے، اہلِ وفا، اہلِ ایمان کے سینہ پر سوار ہو بیٹھا۔

؎ اس خطا میں مجھے مارا کہ خطا وار نہ تھا

ملّت تھوکتی رہی لیکن وہ علی کا نام لیوا منافق نہ اُترا تا وقتیکہ کوئی زیادہ زبردست شب خون مار کر خود نہ چڑھ بیٹھا۔ رہی بیچاری ملّت مجروحہ تو وہ بدستور پا بہ زنجیر رہی۔ کنیز کی کنیز رہی۔ دن رات اسلام اسلام کی رٹ سے مت ماری گئی تھی۔ خر دماغ بنا دی گئی تھی۔ آگے ایسی گاجر لٹکا دی گئی تھی کہ دن دن گنتے برسوں گذر گئے۔ حالت وہی رہی جو روز اوّل تھی۔ ملّت خود جمہوریت کی بھوکی رہی اور اپنی محنت کا پھل کبھی سورج ڈھلنے کے بعد پینے والے اور کبھی رات تو رات دن کو بھی پیتے رہنے والے خود ساختہ امیر المومنین کے

دسترخوان پر چنتی رہی۔ شراب ناب کا پیالہ اور اپنی پٹ رانی کا متوالہ جب مکار کی چالوں میں آکر ریاست کی سالمیت فنا کر چکا تھا تو بچے کھچے



ملک کو بچانے کے نام پر وہی مجسم مکر آگے آیا۔ نشہ پانی کا عادی نہ تھا۔ حالانکہ کبھی کسی محفل میں گھونٹ دو گھونٹ پی لینے کو عیب بھی نہ سمجھتا تھا۔ اس نے ریاست کو جدید بنانے کے نام پر اسلامی سوشلزم کا ڈنکا بجایا خالص اسلام کی ڈگڈگی بجانے والے ہی کیا کچھ کم جمع باز نکلے تھے۔ اسلامی سوشلزم کے ڈنکے نے تو ہر ایک کو چونکا دیا۔ ہر ایک نے اُسے مسیحائے وقت اور نجات دہندہ سمجھ کر وفاداری کا دم بھرا لیکن نئے انتظام کے تحت پہلے ہی چناؤ میں اس اہنکار کے مارے کی جمہوریت نوازی کا بھرم کھل گیا۔ ایسے گل کھلائے کہ جمہوریت کا پودا مرجھانے لگا۔ لوگ حکومت سے بدظن ہونے لگے۔ اور پھر اسی پرانے خالص اسلام کی گھٹی پلانے والا ایک اور بچہ سقّہ نجانے کہاں سے نمودار ہوا۔ راتوں رات سب کو بند کر کے مسندِ حکومت پر قابض ہو بیٹھا۔ تین ماہ کے اندر چناؤ کرانے کا وعدہ کیا۔ پھر یہ مدت بڑھانے لگا۔ اور آخر کار صاف مکر گیا۔ کہتا ہے اسلام میں چناؤ کا ضابطہ و قاعدہ کہاں؟ "پر وہ ٹھیک ہی کہتا ہے" میں نے عرض کیا

لاهور نامہ

"اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے نا۔ چناؤ کا ضابطہ سُنّتِ محمدی کہاں؟ ملّت کا نشان مجلس قانون ساز کہاں؟ خنجرِ ہلال کا ہے قومی نشاں یہاں — ہے نا" "پھر بھی" میں نے پوچھا اگر بالفرضِ محال چناؤ ہوں اور صدر صاحب بھی اپنے گماشتے میدان میں اُتار دیں تو نتیجہ کیا نکلے"۔ جواب میں بات دوہرائی گئی۔" اگر بالفرضِ محال چناؤ ہوں اور صدر صاحب اپنے گماشتے میدان میں اُتار دیں تو نتیجہ کیا نکلے؟" اور پھر جواب آیا۔

میرؔ کیا سادہ ہیں کہ بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطّار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں!

"صاحب ہمارے صدر صاحب بہت سمجھ دار ہیں، اُنہیں کیا کسی باؤلے کتّے نے کاٹا ہے جو ایسی راہ پکڑ بیٹھیں کہ تخت و تاج سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔"

"پر چھوڑو جی اِن باتوں کو" میں نے کہا۔

"یہ تو ہم سیاست میں اُلجھنے لگے۔

اُن کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

کچھ اپنا بتاؤ۔ تنظیم کا کیا حال ہے۔ جڑیں کتنی گہری ہیں، آبیاری کیسی ہے، لہو گرم رکھنے کا کیا انتظام ہے؟

بولے" ہمارے ملک میں اخباروں کے مرکز کراچی، لاہور، راولپنڈی، پشاور، اور کوئٹہ ہیں۔ ملتان اور فیصل آباد (لائلپور) بھی اُبھر رہے ہیں۔ جرنلسٹوں کی تنظیم پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے علاوہ ہر اخبار کی اپنی یونین ہے اور سب کو ملا کر ایک آل پاکستان نیوز پیپر ایمپلائز کنفیڈریشن ہے۔ جڑیں خاصی گہری ہو چکی ہیں۔ سرکار نے کئی بار اُکھاڑنے کی کوشش کی لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ توڑ پھوڑ کی کوشش جاری ہے لیکن جڑیں اتنی گہری ہو چکی ہیں کہ پانی کی جگہ تیل دینے والوں کے دستِ فنا سے بچی ہوئی ہیں۔ ملک بھر کے جرنلسٹ تنظیم کو اپنے خون سے سینچتے آئے ہیں۔ اِس پودے کو سینے سے لگا کر بچانے کس کس بلا سے کس کس طرح بچا پائے ہیں۔ آزادیٔ صحافت کے لئے قید بھی کاٹی ہے کوڑے بھی کھائے ہیں۔

"کہنے لگے اکیلے اکیلے رہتے تو تنکے سمجھ کر مروڑ دیئے جاتے۔ اکٹھے ہیں اس لئے بچے ہوئے ہیں۔ بلکہ ڈٹے ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہم باز نہیں آئے۔ دستِ شیطان پر ایمان نہیں



بابۂ زنجیر مریض - ایڈیٹر مساوات ارشاد راؤ

لٹے چونکہ بیشتر مالک ہتھیار ڈال چکے ہیں لہذا کارکن صحافی بھی چُپ رہنے پر مجبور ہیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ دل میں کیا ہے ۔ ؎

وقت آنے پر بتا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

چائے کے دَور چلتے رہے اور ہماری بات چیت کبھی با آواز بلند اور کبھی محض سرگوشی سے جاری رہی ۔ یہ مت سمجھئے کہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں یا آگے لکھوں گا ۔ وہ کسی بات چیت کی لفظ بلفظ رپورٹ ہے ۔ تین چار گھنٹے کی کل بات چیت، کبھی مل کر اور کبھی الگ الگ کا خلاصہ ہے کہتے لگے رہا لہو گرم رکھنے کا انتظام ؟ تو اس کسرت کا ابھی وقت نہیں آیا ۔ سوچ رہے ہیں کہ کسی روز کھڑکا دیں ۔ دیکھ رہے ہیں ۔ تیل دیکھو تیل کی دَھار دیکھو ۔

میں نے پوچھا کہ ملک کی جرنلسٹ برادری میں خاص ضیا، نواز کتنے ہوں گے ؟ بولے یہی کوئی دس بیس، دو تین کراچی میں، تین چار لاہور میں، دُو دُو چار چار کہیں اور ۔ کون ہے جو وقت کے نمرود کے ساتھ ہے پھر نہ کہے ۔

؎ کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کہنے لگے " جو کچھ اس نے کیا ہے وہ اُس کے ساتھ ہو تو کتا تک نہ بھونکے گا یا پھر کتے کی موت مارا جائے گا ۔" (مجھے یاد آگیا ۔ عراقی مجھے خاص طور پر بغداد جدید و قدیم کی فصیل کے اس حصے میں لے گئے تھے جہاں نوری السعید کی لاش ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کو ڈالی گئی تھی) پریار میں پوچھ بیٹھا لاہور میں تو ایک جرنلسٹ بڑا ضیا، نواز بنا پھرتا تھا ۔ نہایت ڈھٹائی سے کہتا تھا کہ سنسر کے بغیر اس ملک کی گاڑی نہیں چل سکتی ۔" " تو اب کون سی چل رہی ہے ۔ دیکھ ہی رہے ہو ۔ بس گاڑی کو کسی کھڈے لائن میں ڈال فقط انجن دوڑا جا رہا ہے سیٹی تک بجانے کی فرصت نہیں ۔ سرپٹ دوڑا جا رہا ہے ۔ کہاں جا ٹکرائے کون جانے ؟ کس طاقت سے ٹکرائے اور کتنے ٹکڑے ہو جائیں، کون جانے "۔۔۔ اور ہاں وہ عبداللہ کی بجائے عبدالرئیس آخر کون تھا ۔ ذرا نام تو لیجئے "۔ میں نے نام تو نہ بتایا، فقط اشارتاً سمجھایا وہ جان گئے بولے " ابھی کھلنڈرا

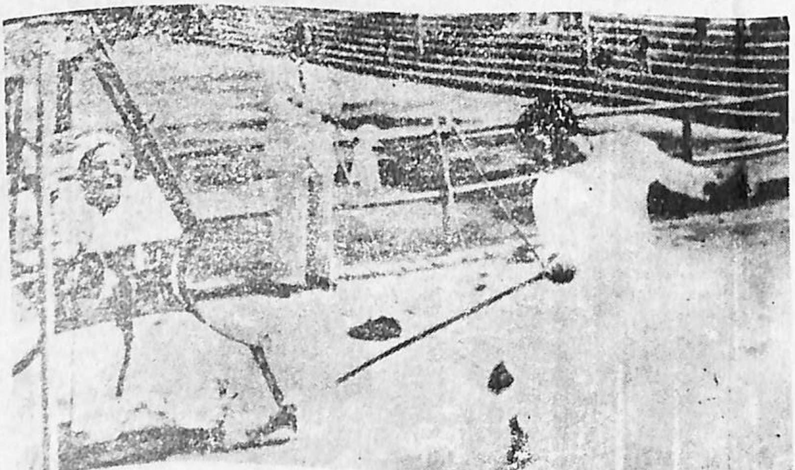
ہے کھیل کود کے میدان سے خبر کھینچنے والا ہے کبھی سیاسی صحافت کی پُرخار وادی میں اُترے اور ریاستِ خموشاں میں اکیلے ہی دندنانے والے کی خبر لے تو اخبار نویس جانیں۔"

وہاں موجود جرنلسٹ کچھ ہماری تنظیم کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے میں نے آسام سے گجرات تک اور کشمیر سے کیرل تک پھیلے ہوئے اپنی فیڈریشن کے یونٹوں کے بارے میں بتایا۔ بولے کہ آیا تمام صوبائی اکائیوں کا آئین ایک سا ہے "نہیں" میں نے جواب دیا، ہر ایک کا آئین الگ الگ ہے۔ اب ایک ماڈل آئین تیار کرنے کا ارادہ ہے۔

بولے "کس کس ملک کی جرنلسٹ یونین سے تعلقات ہیں" بتایا فلاں فلاں ملک کے ساتھ رام سلام ہے "— بولو کہو آپ کے ساتھ یہیں معاہدہ ہو جائے۔ ہم تو ہر طرح راہ و رسم بڑھانے اور دوستی کی بنیاد رکھنے کو تیار ہیں۔" جواب آیا۔

"ہم بھی چاہیں گے لیکن ابھی کچھ وقت لگے گا"

نشست لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے بات کا رُخ پھیرتے ہوئے سندھی کے بارے میں پوچھا۔ جواب ملا دھیرے دھیرے زبان کی حیثیت بڑھتی جا رہی ہے۔ اخبار بھی چھپ رہے ہیں، شاعری بھی ہو رہی ہے اور ناٹک کا شوق بھی بڑھ رہا ہے۔ رسم الخط نسخ ہے۔ حروف



اسلامی حکومت کے نفاذ کا ڈنکا بجانے کی شہادت
ٹکٹکی سے باندھ کر کوڑے لگائے جا رہے ہیں۔

ٹھٹھی میں مخصوص سندھی آوازیں شامل کر لی گئی ہیں۔ پوچھنے لگے کہ سنا ہے کہ سندھی کا شمار بھارت کی سرکاری زبانوں میں بھی ہونے لگا ہے۔ کیا سندھی ذریعہ تعلیم بھی ہے؟ میں نے بتایا کہ بمبئی، جودھپور میں خطِ نسخ میں اور دلی میں خطِ ناگری میں پڑھائی جا رہی ہے۔ بمبئی میں ایک دو سندھی اخبارات تو اب بھی نکل رہے ہیں۔ ہاں اچھی کتابوں کا قحط ہے۔ شاہ عبداللطیف کی کافیاں کہیں ملیں تو میں بھی ایک نسخہ لے جانا چاہوں گا۔ اسی سنت کے لاکھوں ماننے والے اُدھر بھی ہیں۔ میری پڑوسن رائے سنگھانی بھابی کی فرمائش ہے۔ بولے آج کل اُن کے عرس کی تیاریاں جاری ہیں۔ کافیاں ہاتھ لگیں تو ضرور لادیں گے۔

پریس کلب میں قیام کے دوران موسم پھر بگڑنے لگا تھا کبھی پھوار اور کبھی بوندا باندی اور کبھی گھن گرج کے ساتھ تیز چھینٹے۔ اس برستے پانی میں ؎

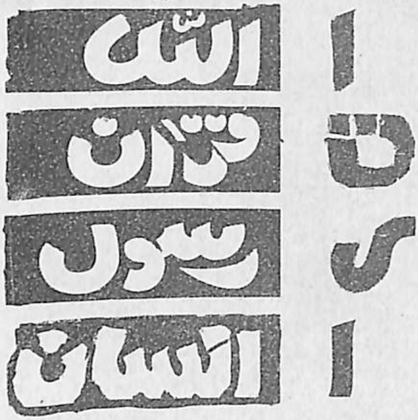
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

پُرتکلف کھانے کے بعد لیکن صرف کھانے کے بعد سب سے اجازت لی۔

وامق شہر کی سیر کرانے کے لئے مٹاڈور لے کر آئے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ نکلے۔ یہ وامق صاحب کوئی عام آدمی نہ سمجھئے، بڑے فنکار ہیں۔ جنڈیالہ گورو (امرتسر) میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن دہرہ دون اور منصوری میں گذرا۔ قدرتی مناظر کی دلکشی نے دل و دماغ پر اثر کیا۔ حسنِ لطیف کو اُبھارا۔ فنونِ لطیفہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ دُنیائے فن کے بہت سے شعبوں میں طبع آزمائی کی۔ اب مصورانہ خطاطی پر کام کر رہے ہیں آیاتِ



اپنے طرز کے استاد وامق



قرآنی کی تشریح مختلف رنگوں اور علامتوں سے کرنے کے علاوہ مختلف رسم الخط لکھتے ہیں۔ پہلی وحی کے پہلے لفظ "اقراء" کی تشریح یوں کی ہے۔

اقرا باسم ربک الذی خلق ۝
خلق الانسان من علق ۝

لکھتے ہیں مصورانہ خطاطی کا یہ مطلب نہیں کہ حروف کی شکل کو بگاڑ کر اور آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر قاری کو اُلجھا دیا جائے اور محض رنگ آمیزی کا سہارا لے کر بدخطی کو خوش خطی کا نام دے دیا جائے۔" مجھے تو کسی سڑک کا نام تک معلوم نہ تھا۔ نجانے کس سڑک سے گذرتے ایک راستہ میں شہیدوں کی یادگار دیکھی۔ شیشہ بند کھڑکی کے پیچھے سے جھک کر سلام کیا۔ پھر کچھ اور راستہ کٹا تو بدلیوں سے گھرے آسمان تلے ایک بلند عمارت دیکھی یہ قائد اعظم کا مرمریں مزار ہے۔ تاریخ عالم میں خواہ ذکر تک نہ پائیں البتہ برصغیر کے کروڑوں



قائد اعظم کا مرمریں مزار

کنبے اُجاڑنے کے بعد مملکت خنجر داد کے بانی مبانی ہونے کے ناتے کوہ قامت مزار تو پالیا۔ آخر ہم کلفٹن پہنچے۔ ہوا گھر سے لائٹ ہاؤس تک سمندر کا نظارہ کیا تو لطف آگیا۔ لیکن ساحل سمندر خاک بسر۔ مجھے اپنے مشرقی اور مغربی ساحل سمندر کو کئی جگہ دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ چوپاٹی تو خیر چھوڑو۔ اب کام کی جگہ نہیں رہی۔ لیکن جوہو، مرینہ بیچ، مہابلی پورم، سومناتھ اور پھر سب سے بڑھ کر پوری کا ساحل دلفریب منظر پیش کرتا ہے۔ جی کرتا ہے گھنٹوں لیٹے رہو۔ بدر کامل ہو تو ٹکٹکی باندھ کر تکتے رہو۔ کبھی لہروں کی نقرئی دیوار دیکھو، کبھی موجوں سے پاؤں چھوتے رہو۔ یہاں تو کانٹوں والی گھاس کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ معلوم ہوا پہلے حالت بہتر تھی۔ اب تفریح کے سامان گھٹ گئے ہیں۔ قریب ہی ایک کیسینو بھٹو کے عہد میں بننے لگا تھا۔ ضیاء نے روک دیا۔ رکھ رکھاؤ کی حالت دیکھ افسوس ہوا۔ اس ساحل کے قریب ایک چھوٹا سا شوالہ بھی نظر آیا۔ وامق صاحب فرمانے لگے۔ یہ دیکھو شوالہ! دیکھنا چاہو گے ہمارے یہاں اقلیتوں کے حقوق بالکل محفوظ ہیں۔" میں یہاں مندر اور مسجدیں دیکھنے نہیں آیا۔ میں نے جواب دیا۔ انسانوں سے ملنے آیا ہوں۔" رہے اقلیتوں کے حقوق تو سینے پر ہاتھ رکھ کر بتا دو کہ ۹۷ فیصد اکثریت کے کون سے حقوق ہیں جو بات ۳ فیصد اقلیت تک پہنچے۔ جمہوریت ختم تو سب کے لئے ختم۔ بحال ہوگی تو سب کے لئے بحال ہوگی۔"

جمہوریت محض نظام حکومت کا نام نہیں یہ ضابطۂ حیات ہے۔ کلفٹن میں ایک مچھلی گھر کو بھی دیکھا۔ اچھا ہے۔ لیکن بمبئی کی ٹکر کا نہیں۔ پھر بھی کچھ تو ہے۔ بارش میں بھی دیکھنے والے آئے ہوئے تھے کچھ اور وقت گذرا۔ شام ہو رہی تھی اور برستے پانی میں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ سردی بھی بڑھ رہی تھی۔ ۲۰ کی صبح کو کھلتی دھوپ میں بھائی عبدالرشید کے گھر سے کوٹ اُتار صرف سویٹر پہن کر نکلا تھا۔ دو دن ایسے ہی گذر گئے تھے اب ٹھٹھرن بڑھنے لگی تو کہیں دم لینے کی پڑی۔ وامق کے ساتھ شہر لوٹ آیا۔ ایک جام چائے چڑھانے کے بعد اُنہیں یار زندہ صحبت باقی کہہ کر اجازت لی اور یار رزمی کے ساتھ کورنگی جا پہنچا۔ گھر والے دو روز بعد صورت دیکھ رہے تھے نہ جانے کیا سمجھ رہے تھے۔ کہاں سے کیسا ملنگ آیا ہے، نہ بھوک نہ پیاس، تھکن نہ کہیں قرار، ۲۲ دسمبر کو تیسرے پہر سُپر فاسٹ سے لاہور روانہ ہونا تھا۔ کراچی میں آخری دن کیسے گذرا۔ اور اُس سے زیادہ چلتی ٹرین میں کیا سُنا یہ پھر سُنئے۔

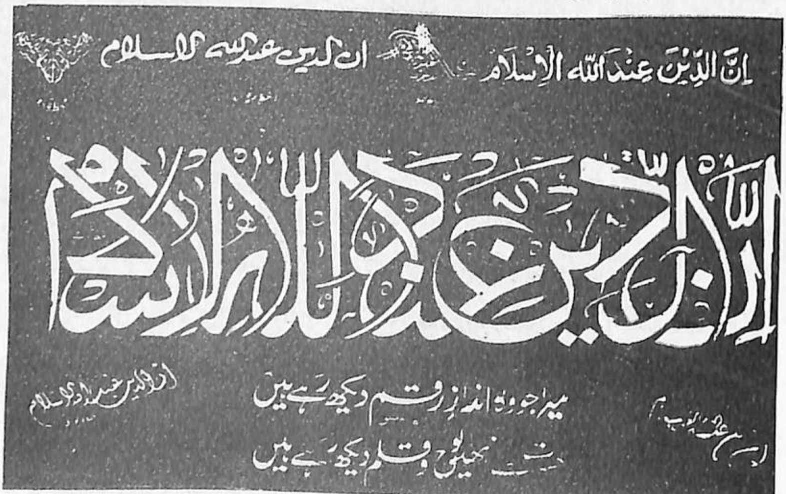
۲۲ دسمبر ۱۹۸۰ء کراچی میں میرا آخری دن تھا فجر کی نماز سے پہلے ہی نیند کھلی تو دیکھا کہ ایک کونے میں رستم قلم نجانے کب سے زیرِ مشق سنبھالے ہیں۔ جب کام ہو تو دن تو دن، دن رات



ایک کر دیتے ہیں۔ کوئی فرمائش ہو تو چار نمونے تیار کر کے آگے کر دیتے ہیں اور انتخاب مہربان پر چھوڑ دیتے ہیں۔ آخر کچھ تو ہے جو سعودی عرب اور مصر تک شہرہ ہے۔ کئی ملکوں کے کرنسی نوٹوں پر خطِ طغریٰ میں جو کچھ عبارت ہے وہ انہی کا شاہکار اور اُن کے ہفت قلم ہونے کی شہادت ہے۔ نیچے ایک ہی چوکھٹے میں کئی خطوں کے نمونے آپ بھی ملاحظہ فرمایئے
جب کام کی محبت اور خدمت ہی عبادت ٹھہری تو نماز کی قضا گناہ کیسی؟

؎ جس روز میں عشق دے لڑ لگی
رب بخشیا کل گناہ میرا

عبدالرشید۔ رستم قلم



جناب عبدالرشید رستم قلم کا ایک ہفت قلمی شاہکار

اپنی حالت یہ تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ ۳۵ برس پہلے ہی

؎ تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

اور ایمان لایا شاعرِ مشرق کے اس فرمودہ پر

؎ پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے۔
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے!

میری کھوں کھاں سُن یار بزمی نے بھی کروٹ بدلی امیـــری زبان سے۔

؎ اُٹھ جاگ مسافر بھور بھئی
اب رین کہاں جو سووَت ہے۔

سُنا تو اُٹھ بیٹھا، چاق چوبند نہ جمائی نہ انگڑائی۔ صبح بخیر صبح بخیر ہونے لگی۔ چائے کا دَور چلا، پھر اَور چلا، کچھ وقت کٹا اندھیرا مٹا، پچھلی شام والی برسات کی رات گئی۔ مطلع صاف اور آفتاب عالمتاب۔

؎ کل صبح جو مطلع تاباں سے ایک عـالم بقعۂ نور ہوا
سَب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نورِ ظہور ہوا

گھر والوں نے ایسا ناشتہ تیار کیا کہ دو روزہ غیر حاضری کی کسر پوری کر دی۔ سامان باندھنے لگا تو بیٹی سلطانہ نے بہن و بھا کے لئے تحفوں سے لاد دیا۔ بیگم بشیر نے چلتے چلتے کلو بھر چلغوزے پکڑا دیئے نا کروں تو کیسے اور شکریہ ادا کروں تو کس کس کا اور کن لفظوں سے۔ سب کچھ قبول! پھر گھر والوں کے ساتھ تصویریں اُتریں کہ یاد رہے کہ کبھی کوئی ملنگ آیا تھا خالی ہاتھ دلی سے لاہور تا کراچی پہنچا تھا آخر سَب سے اجازت لی بچّوں کو پیار کیا۔ میرے پاس بھلا پیش کرنے کو کیا تھا۔ سوائے اپنا عشق حقیقی اور ایک علامتِ عشق۔ تاج محل۔ وقت کم تھا اور کئیوں سے ملنا باقی تھا۔ یہی طے پایا کہ "جنگ" کا آخری نظارہ کر لیا جائے پھر "جسارت" اور "حریت" والوں کو رام سلام کر کے جلد سے جلد "امن" کی راہ پکڑلی جائے۔ پھر آگے کا سوچا جائے۔ کورنگی سے ٹیکسی پکڑی۔ راستہ میں نہ جانے کوئی حادثہ پیش آیا تھا۔ ٹریفک جام ہو گیا۔ اور بمبئی کی طرح دیکھتے دیکھتے سینکڑوں کاروں اور ٹرکوں وغیرہ کی لین ڈوری بندھ گئی۔ ڈرائیور پٹھان تھا جب مجھے ایک کچّا راستہ نظر آیا تو اُسے کہہ بیٹھا کہ اُدھر سے نکال لو ۔جواب آیا ہم اپنے ملک

میں تو کچھ بھی کر لے گا لیکن یہاں پاکستانی پولیس کھڑی ہے۔ پکڑ لے گی۔

"پاکستانی" میں نے کہا "خان! تم بھی تو پاکستانی ہو!" پاکستانی۔ جواب آیا۔ "ہم نہیں جانتا ہم جانتا ہم پٹھان ہے"۔۔۔ میں نے اُسے خالص پٹھان سمجھ کر بات ختم کر دی۔ جوں توں کر کے ہم شہیدی پرنٹرز پہنچے جہاں میں نے سوٹ کیس رکھ دیا کہ سٹیشن جاتے وقت لیتا جاؤں گا۔ اور ہم دفتر جنگ پہنچے سب سے اجازت لی اور سب کو دلی آنے کی دعوت دی "امن" کے قلمکار پہلے جنگ میں تھے۔ نجانے کس بات پہ جنگ ہوئی جو الگ ہو امن کا ڈنکا بجانے لگے۔ پیشانی پر یہ تحریر "جنگ سے نفرت امن سے محبت" کتنی معنی خیز ہے۔ "جنگ" یا "مشرق" سے تو خیر کیا ٹکر، بہر حال اچھا سنجیدہ پرچہ سمجھا جاتا ہے۔ ایڈیٹوریل روم بے شک تنگ ہے لیکن جرنلسٹوں کا دل تنگ نہیں۔ کچھ پرانے پاپی بھی ہیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے۔ بھارت میں بھی اور پاکستان میں بھی۔ ادارے کے پاس وسائل کی کمی ہے۔ لیکن آن والے ہیں۔ گاڑی شان سے کھینچ رہے ہیں۔ کہنے لگے "بہت ہو چکا۔ سب سمجھ گئے اپنی اپنی اصلیت۔ جنگ باز بھی گئے۔ تاریخ کے زاغ بھی گئے۔ اب امن اور صرف امن کی ضرورت ہے۔ زاغ نہیں فاختہ۔ دنیا بھر میں بھی اور بھارت اور پاکستان میں بھی۔ قوم پر کتنا بوجھ پڑتا ہے جنگ کی تیاریوں سے ملک کی کتنی بربادی ہوتی ہے جنگ میں۔ بھارت اور پاکستان کو عہد کر لینا چاہیئے کہ وہ آپس میں کبھی جنگ نہیں کریں گے مسئلے کچھ بھی ہوں جنگ اُن کا حل نہیں ہے"۔ یہ بات پلے باندھ لیں گے تو دونوں سُکھی رہیں گے۔ ان نیک خیالات و جذبات سے میں نے سو فیصد اتفاق کیا اور یقین دلایا کہ ریاستوں کی باہمی جنگ کے لئے یہ قلم کبھی استعمال ہوا ہے نہ ہو گا۔ بدی اور بدعتوں کے خلاف جہاد جاری رہے گا اور قلم کی طاقت سے دنیا بھر کے ٹینکوں کو ٹریکٹروں میں ڈھال دینا ہمارا منشاء و مدعا مسلک و مقصد رہے گا۔

وہاں سے اجازت لی اور پریس کلب پہنچا۔ پاکستانی جرنلسٹوں کی شرائط ملازمت و نظام اجرت کے بارے میں نیز اُن کی تنظیم اور کنفیڈریشن کی تنظیم کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا تھیں وہ تو ایک روز پہلے ہی ہمارے بارے میں پوچھ بیٹھے تھے میں نے اُن کے بارے میں کچھ نہ پوچھا تھا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہاں جرنلسٹوں کے تنخواہ سکیل ہمارے سے بہتر ہیں۔ اور دوسری سہولیات بہت زیادہ ہیں۔ اسے محض اتفاق سمجھئے کہ پاکستان کے

ڈائریکٹر ایکسٹرنل پبلسٹی شری عزیز رضوی بھی وہاں موجود تھے۔ بعض بھارتی جرنلسٹوں کے بارے میں پوچھنے لگے۔ شری پریم بھاٹیہ اور شری ڈی آر منکیسکر کے مدّاحوں میں ہیں۔ شری منکیسکر سے تو وہ کسی زمانے میں کام بھی سیکھتے تھے اور حال ہی میں بلگریڈ میں مل چکے تھے۔

میں پوچھ بیٹھا کہاں کے ہو؟ بولے حیدر آباد کا، اور پھر تو گویا اُن کی بہت سی پُرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ وہاں کے مشہور رکھنہ برادران کو تو جانتے ہی تھے۔ بھارت چند کھنہ کے کلاس فیلو بھی نکلے کہنے لگے "آپ کے وزیر خارجہ نرسمہاراؤ ہمارے وقت کے طالب علم تھے یا کچھ آگے تھے کبھی ملنے کا اتفاق ہو تو بتانا امجد یوسف زئی کی والی بال ٹیم میں تھے یہ میں جانتا تھا کہ نرسمہاراؤ صاحب کئی خوبیوں کے جوہر ہیں لیکن یہ بھید کراچی میں کھُلا کہ جامعہ عثمانیہ میں ماہر العلوم (ایم اے) تک آپ کی تعلیم اُردو ذریعہ تعلیم سے ہوئی تھی - اتحادی سبھا میں باجپئی نے کاشی کی ہندی کے ڈنکے بجائے تھے۔ آپ حیدر آبادی اُردو کا طبلہ بجادیں تو پاکستان تک قائل ہو جائے۔

کھانے کی تیاری تھی تو ایک جرنلسٹ مجھے الگ باہر باغیچہ میں لے گیا۔ ہم پہلے مل چکے تھے لیکن اس سے کچھ سوال وجواب نہ کیا تھا۔ سُنتا رہا تھا۔ الگ بیٹھے تو کہنے لگا کرپشن کہاں نہیں ہے، بھارت میں کیا کچھ کم ہے، پولیس ہر جگہ کرپٹ ہے لیکن یہاں تو مارشل لا کے طفیل فوج کا بھاری حصّہ بھی کرپٹ ہوچکا ہے - ایک اندازے کے مطابق ۶۰ فیصدی تک افسر کرپٹ ہوچکے ہیں اور دراصل وہی ہیں جو اس صدارت کے ستون بنے ہوئے ہیں۔ اس صدارت تو صدارت ریاست کا کیا حال ہوگا؟ جفاکشی کا یہ عالم ہے کہ کسی کرنل ٹائپ افسر کی بیٹی کا بیاہ ہو تو میجر کے رینک کے چار افسر بازار جا آٹھ صرافوں کو پکڑ لاتے ہیں بات کی بات میں پچیس پچیس ہزار اینٹھ لیتے ہیں اور کرنل کی بیٹی کو دو لاکھ کے تحفے پیش کر صاحب کی مونچھ کا بال بنتے ہیں۔ خود ہاتھ رنگتے ہیں اور پیشہ کا منہ کالا کرتے ہیں۔ کہنے لگے ہمارے صدر صاحب بہت متقی مزاج سمجھے جاتے ہیں۔ ہوں گے۔ ۲۰ ویں صدی کے ترقی پذیر گنگا جمنی معاشرے کو صدیوں پُرانے صحرائی سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں آج کے آس پڑوس چھوڑ صحابہ کا زمانہ واپس لانا چاہتے ہیں وہ اسلام لانا چاہتے ہیں، جو دین حجازی کی زنگ برنگی تاریخ کی ایک داستان پارینہ ہے جب قاسم اور طارق اور غزنوی اور تیمور کی تلواروں نے ؎

دشت تو دشت دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

ایشیا کے اس حصّہ سے لے کر یورپ کے اس حصّہ تک فتح و نصرت کے ڈنکے بجائے تھے۔ وہ جرنلسٹ بولا۔ مانا بھٹو بڑا مکار تھا۔ لیکن اس جفاکار نے تو مارِ آستین کا روپ دکھایا ہے۔ محسن کو گدی سے اُتار دینا ہی کیا کم احسان فراموشی ہے یہاں تو محسن کو ڈس کر محسن کُشی کا ملعون مظاہرہ ہوا ہے۔ بعینوں میں شمار ہوا ہے اور بھی زیادہ شرم کی بات یہ ہے کہ علماء وقت نے ملّت کو ایک مکّار سے نجات دلاتے دلاتے ایک جفاکار کو گردن پر سوار کر دیا۔ پھر بولا۔

مکّار کی مکاریوں، جفاکار کی جفاکاریوں اور مُلّاؤں کی جہالتوں کا ایک مفید اور اُمید افزا یہ نتیجہ ضرور نکلا ہے کہ ہر پڑھا لکھا بلکہ اَن پڑھ تک پاکستانی یہ سمجھنے لگا ہے کہ ہر ملک و ملّت اور ریاست کی زندگی کے لئے " ہر نیم حکیم خطرہ جاں، نیم مُلّا خطرۂ ایماں" سے بچنا از بس ضروری ہے۔ ورنہ موت نوشتہ تقدیر سمجھو۔ اب کہ اس جفاکار کے منہ کو لہو لگ چکا ہے اور وہ مارِ آستین پوری ملّت کو ڈسنے لگا ہے پوری قوم کو پسو پڑے ہیں۔ سوچا تھا کیا کیا ہو گیا۔

ع درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

لیفٹ والے تو خیر سدا ہی خالصہ تیار کی طرح تیار رہتے ہیں اب کیا ادھر والے کیا اُدھر والے سب اُٹھنے لگے ہیں۔

لیفٹ والے تو یہ کہہ کر دل کو دلاسے دے لیتے ہیں۔

ع ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

لیکن وہ جو اصل اسلام کے شیدائی اور متوالے مزار شاعرِ مشرق میں قدم تک رکھنا بدعت سمجھتے ہیں وہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ؛ آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔

کراچی کا وہ جرنلسٹ کہنے لگا۔ ظلم کہاں نہیں ہوتا غریب نے پسنا ہی پسنا ہے۔ موٹے کی گردن تو پاٹ میں آ ہی نہیں سکتی۔ ہمیں رات دن بتایا جاتا ہے کہ بھارت کے اس حصّہ میں یہ ہو گیا اس حصّہ میں وہ ہو گیا۔ شب و روز کے ہنگامے بھارت کی سیاسی زندگی کا معمول ہے۔ یہاں پر سرکاری پراپیگنڈہ سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ بھارت بد انتظامی کی تصویر ہے اور پاکستان دارالامن لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہی ہنگامے بھارت کی زندگی کا ثبوت ہیں۔

ہمارے یہاں کیا ہے ؟ سب کچھ بند۔ ملت کی ملت پابندِ سلاسل۔ فوجی جج ایسے جو قانون کی ابجد سے ناواقف۔ بس جو سزا صدر نے تجویز کردی وہ صادر کر دی۔ روز نیا مارشل لا آرڈر بلکہ ایک ایک دن میں دو دو بار ایک ہی آرڈر میں ترمیم۔ پاکستان میں بڑی بڑی دلچسپ حکومتیں رہی ہیں۔ لیکن ریاست کا تیا پانچہ یوں کر کے رکھ دیا جائے گا یہ کسی نے نہ سوچا تھا۔ ریاکار کے بعد جفاکار۔ اس تجربے نے ملک کے دانشوروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔"

بولا "صحافی تو محض مبصر ہوتے ہیں کسی قانون داں سے ملو تو وہ بتائے گا کہ اللہ کی حکمرانی کے نام سے ہمارے صدر صاحب کلمہ پڑھ کر قسمت کی ماری ملتِ مجروحہ کی مہین گردن پر کیسی کُند چھری کو دھیرے دھیرے پھیر کر کیا مزے لوٹ رہے ہیں۔ کیسا سکونِ قلب پا رہے ہیں، مہرگل کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔"

کھانے کے بعد سب سے اجازت لے کر پریس کلب سے نکلنے لگے تو اطلاع ملی کہ مشرق والے انتظار میں ہیں۔ لاہور سے کئی بار پوچھا جا چکا ہے کہ وہ جو دہلی سے آیا ہوا ہے کس حال میں ہے۔ ذرا دھیان رکھنا اور ہاں مشرق کے دفتر ضرور بلانا۔ آخر میں اور میرا یار بزمی سکوٹر رکشا پکڑ کر مشرق جا پہنچے۔ دفتر کیسی خاموش سڑک پر اور کیسے پُربہار احاطہ میں ہے وہاں تو بہت سے ملنے والے تھے اور کس محبت سے۔

تین بجنے کو تھے اور ابھی ہمیں کہاں سے سامان لینا اور کہاں سٹیشن پر پہنچنا تھا بس ایک پیالہ چائے پی کر سب کا شکریہ ادا کر کے نکلنا چاہتے تھے کہ یاروں نے روک لیا اور کہدیا کہ دفتر کی گاڑی جہاں کہو گے جس رفتار سے چاہو گے پہنچا دے گی۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد نکلے تو وین ڈرائیور نجانے کیسا نکلا۔ شاید کچھ کچھ بہرا تھا۔ شہیدی پرنٹرز پہنچ کر میں اور بزمی اُترے اور سوٹ کیس پیچھے رکھا اور اُس سے پہلے کہ ہم سوار ہوتے وہ ہوا ہوگیا۔ وین ہوا سے باتیں کرتے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ہم آوازیں دیتے ہاتھ ملتے رہ گئے۔

منٹ منٹ اُڑتا گیا اور سڑک پر ٹیکسی ملنے میں نہ آئے۔ آخر کسی طرح سٹیشن پہنچے۔ گاڑی چھوٹنے میں فقط پانچ سات منٹ باقی اور وین کا کچھ پتہ نہیں۔ پھر نہ جانے بزمی نے بھاگ دوڑ کر اُسے کہاں ڈھونڈ نکالا۔ سامان سر پر اُٹھا مجھے بھی دوڑایا اور عین وقت پر ڈبے میں جا چڑھایا۔ بھائی عبدالرشید بھی پہنچ چکے تھے ایک دو اور بھی تھے۔ ڈبے میں تو تِل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ مانا کسی کی غلطی سے سونے کی برتھ ریزرو نہ ہو سکی تھی لیکن بیٹھنے کی جگہ تو ریزرو تھی۔ وہاں وہ بھی ملنی مشکل تھی۔ گاڑی کا نام

سُپر فاسٹ لیکن چلے تو ـــــ آدھ پون گھنٹہ تو وہیں لیٹ ہوگئی۔ اور بھیڑ بڑھتی گئی۔ سعودی عرب سے لوٹنے والے اور پنجاب کی طرف جانے والے اپنے سازوسامان سمیت سفر میں تھے۔ سوٹ کیس پر سوٹ کیس، بیگ پر بیگ، ۸۰ کی جگہ ۲۰۰ سو مسافر تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ سردیوں میں بھی دَم گھٹنے لگا۔ ٹرین آخر سرکی جنہوں نے اس اجنبی شہر کراچی میں شروع سے آخر تک ساتھ نبھایا تھا اُن سے اجازت لی اور اپنی خطاؤں کے لئے معذرت کی۔ پُرنم آنکھوں سے دیکھتے اور خداحافظ کہتے کہتے ایک دُوسرے کی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ نشست کیسے سنبھالی جائے اور اُسے کیسے سنبھالے رکھا جائے۔ ایسی حالت میں مزاج برہم ہونا اور توازن کھو بیٹھنا کچھ عجب نہیں اور یہی حالت وہاں پیدا ہونے لگی۔ کچھ سَواریاں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگی تھیں وہ تو بھلا ہو تین لاہوری بھائیوں کا، بالکل گاما ماجھے نظر آتے تھے۔ جنہوں نے اپنی زندہ دلی سے ماحول کو بگڑنے سے بچائے رکھا وہ ہر ایک کے آڑے آئے اور جب اُنہیں معلوم ہوا کہ میں بھی لاہوری ہوں تو مجھے بھی سنبھال لیا۔ پھر تو کھانا پینا سب اُن کے ساتھ رہا۔ اور لاہور تک اُن کا ساتھ رہا۔

رات آئی تو جو فرش پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے بھی ٹانگیں پھیلائیں۔ اب تو بیت الخلاء تک رسائی ناممکن۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اندر بھی دو نوجوان سوٹ کیس پر سوٹ کیس لادے کھڑے تھے۔ رات ڈیڑھ دو بجے ٹرین اچانک رُک گئی۔ باہر اندھیرا، جنگل بیابان، منٹ منٹ کرکے ایک گھنٹہ گذر گیا۔ کچھ اور وقت گذرا۔ اُونگھتے لوگ بھی بے چین ہو اُٹھے۔ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ پر وہاں بتانے والا کون تھا؟ پھر ایک بڑھیا بولی۔

"وہ جو حال ملک کا ہو چکا ہے وہی گاڑی کا بھی ہوگیا ہے۔"

کیا معرکہ کا جملہ تھا۔ صورتِ حال کا آئینہ دار، بڑھیا نے ملک کی حالت گاڑی کے آئینہ میں دکھادی تھی۔ آخر جوں توں کرتے گاڑی سرکنے لگی۔ گاڑی کیا وہ تو گڈ بن گئی تھی۔ رینگتے رینگتے کبھی جمپ مارتے، کبھی ڈھمب کرتے بڑھ رہی تھی یعنی ـــ

"رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا"

پر وہاں صبح کو بھی آرام کہاں تھا؟ بے آرامی کے رات کے بعد بے آرامی کا دن۔ ایک بار پھر وہ زندہ دلانِ لاہور آڑے آئے اور لطیفوں سے ماحول کو قہقہہ زار بنانے لگے کچھ آپ بھی سُنئے۔

ایک کہنے لگا "صاحبان! میں پہلے نہیں بتاؤں گا کہ یہ قصّہ کس کا ہے۔ آپ خود ہی جان لوگے ایک بار انہوں نے حجامت کرانے کے لئے سلمانی صاحب کو طلب کیا۔ اس نے کپڑا باندھا اور بالوں پر پانی پھیرا تو انہیں بہت سخت پایا۔ کاٹے تو کیسے کاٹے۔ آخر کچھ سوچا پوچھ بیٹھا۔ صدر صاحب چناؤ کب ہوں گے؟" یہ سنتے ہی صدر صاحب کی نظریں ترچھی اور بال کھڑے ہو گئے۔ سلمانی صاحب نے فوراً قینچی چلا دی اور کچھ بال کاٹ لئے۔ پھر جو صدر صاحب کی نظریں معمول پر آئیں تو بال بھی بیٹھ گئے اور اُنہیں کاٹنا پھر مشکل ہو گیا۔ ایک بار پھر عرض کی "جناب صدر صاحب! لوگ پوچھتے ہیں چناؤ کب ہوں گے"۔ صدر صاحب نے پھر ترچھی نظروں سے دیکھا اور بال پہلے کی طرح کھڑے ہو گئے۔ سلمانی نے اپنا کام ختم کیا اور چلنے لگا تو کمرے سے باہر ایک اے ڈی سی نے روک لیا اور غرّایا "تو ذات کا حجّام، تجھے اپنی اوقات معلوم نہیں صدر صاحب سے سوال کرتا ہے چناؤ کب ہوں گے۔ یہ پوچھنے کی جسارت کرتا ہے ابھی تجھے بند کرتے ہیں"۔

"نہیں صاحب!"۔ سلمانی پکار اُٹھا "معاف کیجئے۔ میں تو بال کاٹنے میں آسانی کے لئے چناؤ کی بات کر رہا تھا ورنہ میرا چناؤ سے کیا تعلق۔ جناب معاف کرو آئندہ ایسی بات پوچھنے کی غلطی نہیں کروں گا"۔

ایک اور لطیفہ سنئے:۔

ایک بریگیڈیر صاحب اپنے گھر والوں سمیت ڈرائینگ روم میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے معمول تھا کہ ہر شام پانچ سات منٹ تک صدر ٹی وی پر ضرور درشن دیتے تھے کبھی کسی سرکاری اجتماع سے خطاب، کبھی کسی سرکاری تقریب میں شرکت۔ ایک روز ایک ڈیڑھ منٹ کے درشن کے بعد صدر غائب ہو گئے تو بریگیڈیر صاحب بولے۔ "کیا بات ہے صدر صاحب اتنی جلدی غائب ہونے لگے"۔ بیگم نے جواب دیا "کارٹون منٹ ڈیڑھ منٹ کا ہی اچھا لگتا ہے"۔

ایک اور لطیفہ سنئیے:۔

صدر صاحب کی بیگم صاحبہ اچانک ایک روز طیارہ پکڑ کر لندن پہنچ گئیں اب صدر صاحب فون پر فون کر رہے ہیں جواب ندارد۔ آخر ملیں لیکن نہ تو جانے کی وجہ بتائیں اور نہ جلد واپس آنے کا وعدہ کریں سنسر کے باوجود خبر اُڑ گئی اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ صدر صاحب پریشان۔ پر کریں تو کیا کریں۔ آخر ایک ایلچی کو لندن بھیجا کہ پتہ کریں۔ ماجرا کیا ہے شکایت کیا ہے۔ وہ بے چارہ پہنچا۔ بیگم کی خدمت میں پیغام پیش کیا لیکن اس نے واپس آنے

سے صاف انکار کر دیا۔ پوچھ بیٹھا کہ آخر ایسی کیا بات ہوگئی جو آپ اس قدر روٹھ گیئں۔ صدر صاحب تو بے حال نڈھال ہونے لگے ہیں۔ بیگم کی عدم موجودگی میں غنچۂ دل مرجھانے لگا ہے بولیں: "جاؤں گی تو تب جب جانا چاہوں گی۔ لیکن تم میرے وہاں سے آنے کا سبب پوچھتے ہو تو سُن لو اور صدر صاحب کو بھی سُنا دو کہ میرا یہ حال کر رکھا ہے کہ پوچھتے تک نہیں اور ملت پر ایسے سوار کہ اُترتے تک نہیں۔"

وہ جوان اور بھی بہت سے لطیفے سُناتے رہے اور یہ جان کر سُناتے رہے کہ سامعین میں میں بھی ہوں۔ بلکہ وہ تو شاید مجھے سُنا رہے تھے۔ باقی تو بہت سے سُن چکے تھے۔

ملتان سے ہی پانی برسنے لگا تھا اور لاہور تک یہی حال رہا۔ گاڑی ڈیڑھ دو گھنٹے لیٹ پہنچی۔ غنیمت ہے پہنچی تو سہی اور میں ایک بار پھر ۲۳ دسمبر کو کوئی چار بجے دفتر مشرق جا پہنچا۔ لاہور میں آخری شام کیسے گذری اور آخری صبح کیسے یہ پھر سنئیے۔

٥

آخری رات علمار کے ساتھ

۲۳؍دسمبر ۱۹۸۰ء کو برستے پانی میں بذریعہ سپر فاسٹ عرف "ڈھیچوں ڈھیچوں" کراچی سے لاہور پہنچا تو کڑاکے کا جاڑا تھا۔ سٹیشن کے باہر ایک بگڑے رکشا والے سے واسطہ پڑا وہی بات جو یہاں۔ قریب جانا ہو تو چلتا ہی نہیں وہ تو میرا اوورکوٹ، فرکی ٹوپی اور سب سے بڑھ کر دربغل ڈنڈا کام آیا۔ قریب کھڑے ایک پولیس انسپکٹر کو اشارے سے سمجھایا اور وہ ذرا غرّایا تو وہی رکشا والا ایک دم تیر کی طرح سیدھا ہو گیا بلکہ وہ بھیگا تو پہلے ہی تھا اب بھیگی بلی بن گیا۔

دفتر مشرق پہنچا تو سامان پہلے ہی ٹائم آفس میں ٹکا دیا۔ ایڈیٹوریل روم میں قدم رکھا تو کئی ساتھی موجود تھے۔ انہیں پہلے سے معلوم تھا کہ کراچی میں مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئی تھی بلکہ ہر کسی نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا ایک کے بعد دوسرے نے سنبھالا تھا اور خوب سنبھالا تھا۔ بولے "بولو! آج رات کس کے ہاں رہنا چاہو گے۔ ہم میں سے ہر ایک میزبان بننا چاہتا ہے فیصلہ آپ پر" ـــ میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی سونے کا وقت کہاں پھر سوچیں گے۔ چائے کا دور چلا اور میں نے عباس صاحب کو ساتھ لے حمام کا رُخ کیا۔ کب کراچی میں بشیر کے گھر عادت سے مجبور۔ برفانی صبح میں بھی ٹھنڈے پانی سے اشنان کیا تھا اس کے بعد تو رہی سہی اجنبیت دُور کرنے اور سب سے پوری طرح گھل مِل جانے کے لئے برسات میں بھی صحرائی تہذیب عارضاً قبول کر بیٹھا تھا۔ میں نے ساتھیوں سے یہ کہہ کر اجازت لی کہ ساڑھے

چھ بجے لوٹ آؤں گا۔ اگلا پروگرام پھر بنے گا۔ یوں ایک منظر سے ہٹ کر میں دوسرے منظر کی تلاش میں نکلا کچھ تو پہلے ہی پتہ تھا کچھ کراچی میں پکا پتہ کر لیا تھا اس بار شہر میں بھی جا پہنچا وہاں تو کتنے ہی تھے انہیں معلوم تھا کہ میں لاہور میں آخری روز ضرور ملنے آؤں گا۔ واقعی جی دار کردار پائے۔ لیکن مجبور ایسے کہ جب میں نے ایک سے پوچھا کہ وہ جو فلاں فلاں اس وقت فلاں فلاں ملک میں گھوم رہے ہیں۔ لوٹ آئیں؟ تو بولا "لوٹ آئیں" "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ کسی طرح ہمیں بھی پر لگ جائیں اور اُڑ جائیں"۔ دوسرا بولا معلوم بھی ہے کہ یہاں جیلوں میں کتنے پڑے ہیں۔ بڑے بڑے اور جانے پہچانے تو چند ہوتے ہیں گمنام سپاہی کو کون جانتا ہے۔ آج کتنے ہی گمنام سپاہی اسلامی ضابطۂ حیات یعنی آلۂ جبر و استبداد کی گرفت میں ہیں۔ وعظ و تلقین و تبلیغ کے بجائے سنگین کی نوک پر "اصل اسلام" لانے کی یہ کوشش اس پندرھویں صدی ہجری میں بھلا کامیاب تو کیا ہوگی، ہاں مہذب دنیا کی نظروں میں اصل اسلام کو ضرور گرا رہی ہے"۔ تیسرے ساتھی نے گرہ لگائی "ملک کی اقتصادی حالت اتنی بگڑتی جا رہی ہے کہ مذہب کی افیم پلائے بغیر ملت کو محو خواب نہیں رکھا جا سکتا۔ بتانے لگا کہ خزانہ بالکل خالی ہو چکا ہے۔ نظم و نسق کا روزمرہ کا خرچ چلانے کے لئے بھی بڑی چھوٹی دکانوں پر چھاپے مار کر روپیہ بٹورا جا رہا ہے۔ دہشت کا دور دورہ ہے اور بڑے بڑے شہر شہر خموشاں کا منظر پیش کرتے ہیں۔ حبیب آدم جی اور ہارون اور دوسرے دھنا سیٹھوں کے بنک حکومت کو دھڑا دھڑ قرضے دیئے جا رہے ہیں کہ یہ حکومت قائم رہے۔ دہشت کا دَور دورہ رہے اور اُن کو، لوگوں کو لوٹنے کی چھوٹ رہے۔ بتانے لگا کہ سیکورٹی پریس دھڑا دھڑ نوٹ چھاپتا جا رہا ہے۔ اور اسی جلد بازی میں بیس کروڑ روپے کی مالیت کے نوٹ غلط نمبروں والے چھپ گئے۔ اُن میں سے کچھ تو واپس لے لئے گئے اور کچھ پر اوپر سے دوسرا نمبر لگا دیا گیا۔ جب نوبت یہ ایں جا رسید تو پھر کچھ ہوتا کیوں نہیں؟ میں پوچھ بیٹھا۔ اس پر چوتھا بولا کچھ نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ زبردست مہنگائی کے باوجود پاکستان میں شاید ہی کوئی بیروزگار ہوگا جب سے تیل دیشوں نے مادی ترقی کی طرف توجہ دی ہے۔ ہزارہا پڑھے لکھے اور اَن پڑھ پاکستانی نوجوان ادھر کا رخ کر رہے ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے کما رہے ہیں اور دل کھول کر گھر والوں کو بھیج رہے ہیں۔ ملک سے باہر جانے کی ایسی دوڑ لگی ہے کہ لاہور اور کراچی ایسے شہروں میں گھریلو کرمچاری ملنا محال ہو گیا ہے۔ صفائی کرمچاری بھی وہی رہ گئے ہیں

جو ہندوؤں میں اچھوت سمجھے جاتے تھے اور تقسیم ملک کے وقت بھارت جانے سے روک لئے گئے تھے اور اب بہت سے عیسائی ہوکر وہی شو دروں کا کام کر رہے ہیں"۔ تو پھر اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ لوگ حال مست رہیں گے، اور مذہب کی گھٹی سے حال مست رہیں گے اور حالت جوں کی توں رہے گی، نہیں یہ بات نہیں کہ حالت جوں کی توں رہے گی، ایک بولا "حالت ضرور بدلے گی۔ سوال یہ ہے کہ وہ نیچے سے بدلے گی یا اوپر سے بدلے گی مطلب یہ آیا کہ ایران کی طرح یہاں بھی کوئی عوامی تحریک آمر کو جلا وطنی پر مجبور کر دے گی یا نیک خو فوجی افسروں کا کوئی گروہ جفاکار کو ہٹا کر ملاؤں کو میدان سیاست سے بھگا کر ریاست کو جدید بنانے کا بیڑا اٹھائے گا۔ ظاہر ہے کہ دانشور موجودہ گھٹن سے تنگ آ چکے ہیں لیکن از خود نظام بدلنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ عوام جو انقلاب لاتے ہیں ابھی منظم نہیں ہیں، کوئی کمال میدان میں اترے تو سب اس کا ساتھ دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ سر دست کہنا مشکل ہے کہ حالات آئندہ چند ماہ میں کیا رخ اختیار کریں گے۔ مطلق العنان کا سنگھاسن ابھی قائم تو رہے گا لیکن ڈولتا ضرور رہے گا۔"

میں نے پوچھا کہ ہندوستان کے بارے میں اب عام لوگوں کا رویہ کیسا ہے؟ وہی سب سے پہلے بات شروع کرنے والا بولا۔ ہم تو خیر شدا سے بھارت پاک دوستی کے علمبردار رہے ہیں۔ اب دھیرے دھیرے عوام بھی سمجھ گئے ہیں کہ بھارت بہت بڑا ملک ہے پاکستان کا اس سے کوئی مقابلہ نہیں۔ اب اگر جنگ ہوئی تو اس ملک کا نام تک نہ رہے گا۔ ایسی صورت حال میں اب بھارت کا کھلا دشمن کوئی نہیں رہا۔ چند ایک جنونی اب بھی کبھی کشمیر کا رونا لے بیٹھتے ہیں لیکن ہر کوئی دل میں جانتا ہے کہ جو ہونا تھا سو ہو چکا جو رہ گیا ہے اس کی خیر مناؤ اور اسی لئے جمہوریت لاؤ۔ مجھے کچھ کریدنے کی عادت نہ تھی۔ بات چیت کرتے ہوئے زائد از ایک گھنٹہ گذر گیا تھا۔ میں نے اجازت چاہی اٹھنے لگا تو ایک بولا "کیا آپ جانتے ہیں کہ پاکستانی فوج کا سب سے بڑا کارنامہ کیا رہا ہے؟ میں نے حیرانی سے پوچھا کہ وہ کون سا کارنامہ ہے جو پاکستانی فوج نے اس ملک کی پوری تاریخ میں انجام دیا ہے۔ بولے واہ آپ نہیں جانتے اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے ہی ملک کو فتح کر رکھا ہے"۔ کیا معرکہ کا جملہ تھا۔ ایک المیہ کی کیسی منظر کشی تھی۔ میں نے چلتے چلتے ان سب کو جو وہاں موجود تھے، کبھی موقعہ ملے تو بھارت آنے کی دعوت دی۔ جواب آیا — ہاں کبھی آئیں گے۔ ابھی تو پھڑ پھڑانا بھی ممنوع ہے۔ کبھی اڑنے کی اجازت ملے گی تو پہنچیں گے۔ پر آپ بھی پھر ضرور

آشنا؟ ـــــ میں بھلا کیا جواب دے سکتا تھا۔ اتنا ہی کہہ سکا۔ اَب ۴۲ برس بعد آیا ہوں، آیندہ تین برس کے اندر آنے کی کوشش کروں گا۔

برستے پانی میں ہی دفتر "مشرق" لوٹا تو چھ بج چکے تھے اور میرا یار بٹ دفتر کے باہر ایک تانگہ لئے کھڑا تھا۔ دیکھتے ہی بولا "چلو جی۔ تُسی اپنا وعدہ نبھاؤ" مجھے بھی یاد آگیا۔ لاہور سے کراچی جاتے اس کے اصرار پر وعدہ کر گیا تھا کہ "آخری رات تیرے نال گذرے گی" ایڈیٹوریل روم میں پہنچا تو ساتھیوں نے پھر زور دیا کہ رات ان میں سے کسی کے ساتھ گذاری جائے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ بٹ کو اگرچہ آپ نہیں جانتے لیکن آج رات اسی کے ساتھ گذرے گی۔ ساتھیوں نے یہ بھی زور دیا کہ لاہور میں قیام کی مدّت میں توسیع کرالوں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ دو چار روز اور گذار لوں لیکن میری طبیعت نو روز میں ہی بھر چکی تھی۔ بہتوں سے مل چکا تھا۔ ہاں اگر جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہا تھا صدر صاحب انٹرویو دینا مان جاتے تو راولپنڈی ضرور جاتا لیکن اَب اتنا سُن چکا تھا کہ اُن سے بھی کچھ سننے کو نہ رہا تھا لہٰذا مدّت میں توسیع خارج از بحث قرار دے دی۔ سَب ساتھیوں سے اجازت لی اور بتا دیا کہ صبح آؤں گا اور ٹائم آفس سے سوٹ کیس اُٹھاؤں گا اور سَرحد کی راہ پکڑوں گا انھوں نے چلتے چلتے گرم گرم چائے کا ایک اور جام پیش کیا اور وعدہ لیا کہ صبح ایک آدھ گھنٹے پھر مشرق میں گذارنے کے بعد ہی روانہ ہوں گا۔ تانگہ میں سوار ہوا تو بٹ سے پوچھا کہ یار یہ تانگہ کس کا لے آئے۔ بولا جی میرا ہے میرے تین تانگے چلتے ہیں۔ ساٹھ روپے روز کی تو یہ کھری کمائی ہے ہم نے پہلے تو مال روڈ مال شاہراہ قائداعظم پر واقع اس ریستوران کا رُخ کیا جس کے مالک نے کراچی جاتے وقت زبردستی پانچ صد روپے پکڑا دیئے تھے۔ وہاں پہنچے پوری رقم واپس کی۔ چائے کا ایک پیالہ پی اجازت لی تو روک کر ایک صحافی سے متعارف کرایا گیا جس نے تقسیم ملک کے بعد سب سے پہلے "پرتاپ بلڈنگ" پر قبضہ کیا تھا اَب کہیں اور رہتے ہیں اور کسی اور جگہ سے "تجارت" نکالتے ہیں۔ شری نریندر اور شری ویریندر کا پوچھتے رہے پھر ایک اَور سے ملاقات ہوئی۔ برسوں بمبئی کی فلمی دنیا سے منسلک رہے تھے اب لاہور کی فلمی دنیا سے منسلک ہیں پرانے وقتوں کو یاد کرتے رہے۔ آخر وہاں سے چلے۔ بٹ کو سب سے پہلے برنڈلا ہال چلنے کی پڑی تھی، تاکہ انور سعید سے اور اس کے بعد قریب ہی موہنی روڈ پر رہنے والے انور بھٹی سے مِل سکیں۔ یہ تینوں ہی پچھلے سال اکٹھے دلی آئے تھے اور حُسنِ اتفاق سے مجھے ملے تھے۔ دونوں مِل گئے۔ کچھ کچھ وقت اُن کے ساتھ گذارنے

کے بعد بٹ کو گلبرگ لے چلنے کو کہا تاکہ مولانا ابومحمد القاسمی صاحب کے ساتھ بھی کچھ لمحے گذار سکوں انور سعید ساتھ ہوگیا اور ہم تینوں اس اندھیاری رات میں پشاوری تانگے میں سوار ہو کر فانی ہواؤں کے مزے لوٹتے لوئر مال اور مال روڈ سے گذرتے گلبرگ میں واقع مدرسہ اسلامیہ جا پہنچے۔

مولانا اپنے شاگردوں سمیت جن میں دو نابینا تھے۔ کھانا کھا رہے تھے۔ نورانی چہرے پر نورانی داڑھی، باریش بزرگ کیسے دلنشین تھے۔ ہمیں اسی کمرے میں بٹھایا گیا۔ جو انہوں نے میرے قیام کے لئے سجا رکھا تھا۔ کچھ دیر میں مولانا بھی آگئے۔ اور فرمانے لگے۔ بہتوں کو آپ سے ملنے کی خواہش ہے اگرچہ کافی رات ہو رہی ہے لیکن پھر بھی ٹیلی فون سے مطلع کر دیتا ہوں شائد کچھ آجائیں اور پھر تو چند منٹ کے اندر اندر تین چار اور باریش بزرگ آگئے۔ ایک بزرگ بولے "ہمیں پتہ لگا ہے کہ بھارتی پنجاب میں ۲۰ ہزار مسجدوں اور مزاروں اور قبرستانوں پر ناجائز قبضے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے میں نے جواب دیا کہ ایسی جگہوں کی کوئی فہرست ہو تو دیجئے میں تحقیقات کرانے کی کوشش کروں گا لیکن یاد رکھئے کہ پنجاب اور ہریانہ اور دلی میں باقاعدہ وقف بورڈ ہیں اور ایک بھی مسجد یا مزار یا قبرستان ایسا نہیں جو کسی غیر مسلم کے قبضہ میں ہو۔ پہلے کوئی مفروضہ قائم کر لینا اور پھر اس پر بہتان تراشی کرنا یہ تو واجب نہیں۔ لائیے اگر کوئی فہرست ہے تو دیجئے میں فضول بہتان سننے کے لئے یہاں نہیں آیا۔"

یہ مد ختم ہوگئی تو وہی مولانا بولے۔ سنتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن کا جو پہلا اور دوسرا مسودہ لکھا تھا اور جو دونوں مسودے قید و بند اور تلاشیوں اور ضبطیوں کے دوران گم ہوگئے تھے اب مل چکے ہیں۔ ترجمان القرآن کے ذکر سے وہ زمانہ یاد آگیا جب اسی شہر لاہور میں میں مضامین آزاد، خطبات آزاد اور تذکرہ پڑھنے کے بعد امام الہند کے اس شاہکار کی تلاش میں نکلا تھا میری عمر وہی ہوگی جو ابوالکلام کی اس وقت تھی جب وہ "القانون" کی تلاش میں کلکتہ میں پرانی کتابوں کی دکانوں کے چکر کاٹ رہے تھے۔

میں جانتا تھا کہ جو مولانا میرے ساتھ ہمکلام ہیں علماء کی اس صف میں شامل رہے ہیں جو نظریہ متحدہ قومیت کی صف توڑ کر باندھی گئی تھی جس میں شامل علماء دین نے اصل اسلام لانے کے لئے مدنی اور ابوالکلام کی رہنمائی چھوڑ کر اپنی نکیل قائد اعظم کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد اسی صف نے آزادی کشمیر کے لئے جہاد کا فتویٰ صادر فرمایا تھا جنہوں نے اسلامی دستور سازی اور اسلامی قانون سازی کے لئے دن رات محنت شاقہ کی تھی اور جن کے سر پر اسلام

کا کچھ ایسا بھوت سوار ہو چکا تھا کہ کافر ادا بھٹو کو کیفر کردار تک پہنچانے اور خالص اسلامی حکومت قائم کرنے میں ضیاء کا ہاتھ بٹایا تھا۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ آج یہ طبقہ بھی حکومت وقت سے بدظن ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ ضیاء نے بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد اس صف کے علما کو بھی حلقہ اقتدار سے باہر نکال دیا۔ دوسری وجہ یہ کہ یہ علماء ایمانداری سے سمجھتے ہیں کہ حکومت وقت نے زکوٰۃ اور عشر کی وصولی کے لئے جو ضابطے نافذ کئے ہیں وہ شرعی اصولوں کے مطابق نہیں ہیں لیکن بدظنی کی تیسری وجہ یہ ہے کہ ریاست پاکستان جو حق خود ارادیت کے اصول کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔ آج ایک فرد کی لونڈی بنا دی گئی ہے۔ لوگوں کو اپنی مرضی کی حکومت چننے کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے کہنے لگے کیا مذاق ہو رہا ہے جو لوگ قیام پاکستان کی جدوجہد میں پیش پیش تھے آج ان کی ایماندارانہ رائے بھی اخبار میں نہیں چھپ سکتی۔ ہمارا ہر بیان سنسر ہو جاتا ہے۔ میرے یہ کہنے پر وہ کچھ جھینپ سے گئے کہ کیا ہوا اگر آپ کا کلمہ حق یہاں نہیں چھپ سکتا۔ مجھے دیجئے اندرا کے حق میں دیجئے، اندرا کے خلاف دیجئے، ضیاء کے حق میں دیجئے، ضیاء کے خلاف دیجئے۔ آپ ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ ہم آپ کا ہر بیان چھاپنے کو تیار ہیں۔ دیکھ لیجئے آپ نے پاکستان بنوا کر کیا پایا اور کیا کھویا ہے۔ برائے نام اسلامی ریاست کا بے رُوح لاشہ لئے پھرتے ہو اللہ تعالیٰ کو سارے مُلک کا مالک اصل اور حاکم حقیقی جانتے ہوئے بھی ایک جفاکار کو اس کے نائب امین کی حیثیت دے بیٹھے ہو۔ آخر یہ تماشہ کب تک چلے گا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم ٭ نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

آدھی رات گذر چکی تھی۔ بٹ اور انور بھی بیٹھے بیٹھے تھک چکے تھے۔ وہ کسی اور دنیا کے تھے اور ہم کسی اور دُنیا میں تھے۔ آخر میں نے سب سے اجازت لی۔ اور مولانا قاسمی صاحب کا اُن کی محبت اور شفقت کے لئے شکریہ ادا کیا اور نہایت ادب سے وہ تین سو روپے واپس کر دیئے جو انہوں نے کراچی جانے سے پہلے زبردستی میری جیب میں ڈال دیئے تھے میں اُٹھا تو مولانا نے نہایت قیمتی سگریٹ کا ایک پیکٹ پیش کیا۔ بولے لندن سے لایا تھا۔ شاید تمہارے کام آئے گا۔

اب پھر ان برفانی ہواؤں میں تانگہ کی سواری شروع ہوئی اور ہم موہنی روڈ پر بٹ کے مکان پر آن پہنچے۔ جہاں میرا رات بھر کا ٹھکانہ تھا۔ تانگہ سے اُترا تو کوچوان کو کچھ انعام دینے کا سوچا پیسے کہاں تھے تھوڑے سے تھے اور ابھی دلی تک کا سفر باقی تھا وہی سگریٹ کا پیکٹ

اس کے حوالے کیا اور اس کا دل کھول کر شکریہ ادا کیا۔ انور نے بھی اجازت لی۔ وہ رات میں اور بٹ ایک ہی بڑے لمبے چوڑے پلنگ پر بچھے مخملی بستر پر ساتھ ساتھ سوئے۔ بٹ کی دلی خواہش پوری ہوگئی اور میری رات کٹ گئی۔

فرق کیا پایا؟

صبح نیند کھلی تو دوسرے کمرے میں ایک بڑی سی پتنگ لٹکتی دیکھی پوچھا ڈور بھی ہے بٹ نے اثبات میں جواب دیا تو میرے سے نہ رہا گیا۔ میں نے کوٹھے پر چلنے کو کہا۔ پوچھنے لگا۔ اُڑانی آتی ہے؟ اب بھلا اسے کون سمجھاتا کہ وہ لاہوری کیسا جو ماں کے پیٹ سے ہی پتنگ باز نہ نکلے۔ آخر اس نے پنا پکڑا اور میں نے ۳۳ برس بعد پتنگ اُڑائی۔ سردیوں کے دن اور صبح ۸ بجے کا وقت آسمان بدلیوں سے گھرا ہوا کبھی بوند بوند بھی پڑے۔ ٹھرک تھا۔ پورا کر رہا تھا خود ہی اُڑائی بادشاہی مسجد کے مینارے کی طرف دُور تک بڑھائی۔ خود ہی موسم بگڑتا دیکھ اُتار لی۔ کچھ پتنگیں لانا چاہتا تھا۔ لا نہ سکا۔ آخر ناشتہ کر کے بٹ سمیت پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچا کہ روانگی کی خانہ پُری کر اکر آگے کا راستہ پکڑوں۔ کلرک بہادر نے چند منٹ میں ہی فارغ کر دیا اور ہم دونوں سکوٹر میں سوار ہو کر دفترِ مشرق آن پہنچے جو بھی اُس وقت تک آ چکے تھے اُن سے اجازت لی پھر شری اقبال زبیری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُن کی اور اُن کے ساتھیوں کی محبت اور خلوص کے لئے ایک بار پھر دل کھول کر شکریہ ادا کیا اور اجازت چاہی۔ وہاں سے فارغ ہوا اور کمرے سے نکلا تو عباس صاحب مل گئے۔ انہوں نے کچھ چھوٹے موٹے تحفے اور پرتاپ کے خوشنویس ساتھیوں کے لئے کچھ بہترین نب پیش کئے۔ اُن سے اجازت لی اور سوٹ کیس سنبھال احاطہ دفتر سے باہر نکلا اور ابھی بٹ کے ساتھ مشورہ کر ہی رہا تھا کہ سرحد کیسے پہنچا جائے

کہ ایک صاحب کندھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ دُور لے گئے میں پہلے بھی اُن سے مِل چکا تھا لیکن کوئی خاص بات چیت اُن سے نہ ہوئی تھی۔ کان میں دھیرے سے کہنے لگے دلی لوٹ رہے ہو بی بی کو کہنا یہ ڈبہ خالی ہے۔ اُسے منہ نہ لگائے۔ نہ اس کو بلائے اور نہ جب تک یہ رہے خود ادھر آئے۔

پاکستانی عوام شریمتی گاندھی کو ایک بہت بڑی شخصیت، ایک تاریخ ساز شخصیت سمجھتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ اُن کی قربت یا صحبت کا یہ جفاکار فائدہ اُٹھائے۔ ہاں یہ جمہوریت بحال کرے اپنی سیاسی پارٹی بنائے۔ آزادانہ چناؤ میں جیت جائے اور پھر شریمتی گاندھی کو پاکستان آنے کی دعوت دے تو کسی کو اعتراض نہ ہوگا لیکن جب تک اُس کے اقتدار کی بنیاد ننگی طاقت کا مظاہرہ ہے اُسے منہ لگانا پاکستانیوں کی نظروں میں شریمتی گاندھی کی عزت نہیں بڑھائے گا۔

میں اجازت لینے لگا تو وہی صاحب اپنی پہلی بات زور دے کر دہرانے لگے " دلی لوٹ رہے ہو۔ بی بی کو ضرور کہنا کہ یہ ڈبہ خالی ہے اُسے منہ نہ لگائے نہ اس کو بلائے نہ جب تک یہ رہے خود ادھر آئے"

"میں شریمتی گاندھی کو کوئی سندیش دینے والا کون؟" کہہ دیا آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی لکھ دوں گا جس کے مطلب کا ہوگا پڑھ لے گا۔

آخر بٹ نے تجویز کیا کہ منی بس سے جانے کے بجائے سکوٹر پکڑا جائے۔ اب ہم دونوں سکوٹر میں سرحد کی طرف دوڑ رہے تھے۔ شالیمار باغ سے کچھ آگے سڑک کے کنارے لگے ایک درخت کی طرف اشارہ کر کے بولا " دیکھو ہندوستانی فوج یہاں تک آ گئی تھی۔" آخر ہم سرحد پر پہنچے۔ بٹ نے سرحد پار کرنے سے پہلے اس ٹھنڈ میں بھی ایک ٹھنڈی بوتل پلا دی اور ہم بغلگیر ہونے کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ پاکستانی کسٹم کے عملے نے مجھے پہچان لیا اور تلاشی لئے بغیر چند منٹ میں خانہ پُری کر دی۔

ہندوستانی کسٹم چوکی پہنچا تو ایک عجیب خرد ماغ انسپکٹر سے پالا پڑا میں یہ کہتا ہی رہا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو اس نے تو سوٹ کیس کھول کر سب کچھ اُلٹ دیا وہ چوڑیاں بھائی بشیر کی بیٹی نے بہن وبھا کے لئے بھیجی تھیں اُن کا ڈبہ تک توڑ دیا چلغوزے بکھیر دیئے کپڑے اُلٹ اُلٹ کر دیکھتا رہا کہ کہیں کچھ ہے تو نہیں۔ میں نے پھر کہا کہ یہ تم کیا تماشہ کر رہے ہو تو نہایت بے شرمی سے بولا " ڈیوٹی دے رہا ہوں" شاید نہیں جانتا تھا کہ ہم بھی جانتے ہیں کہ وہاں ادھر اور ادھر روزانہ مسافروں کو کس طرح پریشان کیا جاتا ہے اور کس طرح پیسے بٹورے جاتے ہیں

اس کے ہاتھ جب کچھ نہ لگا تو بولا اور کوٹ میں کوئی ٹوائن وَن تو نہیں چھپا رکھا۔ میرے کہنے پر کہ وہ کیا ہوتا ہے۔ شاید اس نے آخر کار سمجھ لیا کہ یہاں کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ اس بدتمیز انسپکٹر سے چھٹی ملی تو باہر نکل امرتسر آنے والی ایک بس پکڑی۔ میرے ساتھ بیٹھنے والا سفید فام پشاور کے ایک بڑے ہسپتال کا ڈاکٹر نکلا جسے ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے افغان رفیوجیوں کی دیکھ بھال کے لئے بھیج رکھا ہے۔ کسی کام سے چنڈی گڑھ میڈیکل انسٹی چیوٹ جا رہا تھا میں نے پوچھا کہ پاکستان سرکار آئے دن اعلان کرتی رہتی ہے کہ افغان رفیوجیوں کی تعداد اب اتنی ہو گئی اور اب اتنی بڑھ گئی حقیقت کیا ہے وہ بولا وہاں سے آنے جانے والوں کا سلسلہ سدا جاری رہتا ہے جو شخص ایک بار ادھر آ گیا اور اس کا نام رجسٹر میں درج ہو گیا اور تعداد میں اس کا شمار ہو گیا وہ اگر واپس بھی جائے تو اعداد و شمار میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رجسٹر صرف آنے والوں کی تعداد دیتا ہے جانے والوں کی نہیں۔ لہٰذا تعداد سدا بڑھتی نظر آتی ہے اسی بس میں میری سیٹ کے آگے تین یمنی طلبہ بھی تھے لاہور میں انجینئرنگ پڑھ رہے ہیں۔ امرتسر اور دلی دیکھنے آ رہے تھے لاہور کی خشک زندگی ایسے بہت سے غیر ملکیوں کو چند دن ادھر گذارنے پر مائل کر دیتی ہے۔

بس امرتسر پہنچی تو سب سے پہلے دیوار پر لکھے جس نعرے پر نظر پڑی وہ تھا۔

"اندرا باہمنی درباره ترکھان۔

بھکا مرگیا ہندوستان

بس یہی فرق تھا لاہور اور امرتسر میں وہاں زبان بندی کا دستور، یہاں زباں درازی تک کی آزادی۔ اب اجازت دیجئے بہت ہو چکی نماز اب مصلےٰ اٹھائیے۔

ع انتے بات ہے ختم کلام

Mr. Bilti

1 [illegible] Culture

2 Chaucer: the Prologue

3 [illegible]

4 [illegible] poetry

5 King Richard II

6 Prose to every d [illegible]

7 English novel [illegible]

8 Socrates in [illegible]

9 [illegible] and Today

10 Essays of Ella

[signature]

سنتوش کمار ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے سلسلہ
میں پورے ملک کا اَن گنت بار دورہ کر چکے ہیں
اس سلسلہ میں ایشیا و یوروپ کے کئی ملک بھی
گھوم چکے ہیں۔ انٹرنیشنل آرگنائزیشن آف جرنلسٹس
کے ہیلنسکی اجلاس میں انہوں نے بطور مبصر
شرکت کی۔ انہوں نے نکارا گویا میں امپیریلزم
کے خلاف منعقدہ عالمی صحافتی کانفرنس میں بھی
بھارت کی نمائندگی کی۔ مختلف اخبارات میں ان
کے مختلف ملکوں کے دورہ کی رپورٹیں بھی شائع
ہو چکی ہیں۔ ان کا ایک سفرنامہ دلی سے برلن ہندی
اور دلی ٹو برلن (انگریزی) میں کتابی شکل میں شائع
ہو کر کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

روڈ رما
واب اُردو
دہلی